روایت کے قیدی

جمیل عظیم آبادی

روایت کے قیدی

(کہانیاں)

روایت کے قیدی

Rewayet Ke Qaidi

(Short stories)

By: Jameel Azeem Abadi

پہلی اشاعت: جولائی ۲۰۰۳ء

کمپوزنگ : میڈیا گرافکس، اے۔۹۷، سیکٹر ۱۱۔اے، نارتھ کراچی

سرورق : سونیا، میڈیا گرافکس، نارتھ کراچی

مطبع : احمد برادرس پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی

قیمت : ۱۵۰ روپے

ناشر : راشد پبلی کیشنز، بی۔۴۵۲۔سیکٹر ۱۱۔اے، نارتھ کراچی

ٹیلی فون: 6908083

انتساب

گلابوں کے شہر اسلام آباد کے نام

جہاں

ایک حسین صبح

میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا

فسانہ میں ہے اک ستودہ روایت

.... ۲۰۰۳ء ....

فسانہ میں ہے اعتبارِ حکایت

.... ۲۰۰۳ء ....

فسانہ ہے دراصل رنگِ حقیقت

.... ۲۰۰۳ء ....

روایت کے قیدی میں موجود اصابت

.... ۲۰۰۳ء ....

''روایت کے قیدی'' ہے باغ و بہار

.... ۱۴۲۴ھ ....

وہ نادر فسانوں کا اک مرغزار

.... ۱۴۲۴ھ ....

سدا گر ہو ظلم و ستم کا رواج

.... ۱۴۲۴ھ ....

عقوبت ہے تحریر سے آشکار

.... ۱۴۲۴ھ ....

خواجہ منظر حسن منظر

ترتیب

صفحہ

ایک جست اور	علی حیدر ملک	۷
جمیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری	شہناز پروین	۱۱
میری کہانی	جمیل عظیم آبادی	۱۷

کہانیاں:

۱	روایت کے قیدی	۲۱
۲	کفارہ	۲۹
۳	خودرَو	۳۷
۴	فتویٰ	۴۱
۵	گھر کا نہ گھاٹ کا	۴۷
۶	سراب	۵۵
۷	چھوٹے نواب	۶۱
۸	دلاور	۶۷
۹	گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل	۷۵
۱۰	دیر ہے اندھیر نہیں	۸۱
۱۱	سبز قدم	۸۵

۱۲...... بوجھ ۸۹
۱۳...... مکافاتِ عمل ۹۷
۱۴...... فرض ۱۰۵
۱۵...... رشتے کی زنجیر ۱۱۳
۱۶...... انا کی بھینٹ ۱۲۲
۱۷...... انتظار ۱۲۷
۱۸...... کھوٹا سکہ ۱۳۲
۱۹...... لے پالک ۱۳۵
۲۰...... منطق ۱۳۸
۲۱...... خواب کی تعبیر ۱۴۱
۲۲...... جوڑے آسمان پر بنتے ہیں ۱۴۳
۲۳...... عربی نسل کا گھوڑا ۱۴۶
۲۴...... سانپ اور سپیرا ۱۴۹
۲۵...... ٹومی ۱۵۲
۲۶...... مٹھو ۱۵۶

....

....

ایک جست اور

ہر زمانے میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے جو زندگی کے کسی ایک شعبے میں بھی کوئی کارنامہ انجام دینا تو کجا تسلی بخش کام بھی نہیں کر پاتے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ شعبوں سے وابستہ ہوتے اور ان سب میں اپنے دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ مخدومی ومکرمی محمد جمیل احسن صاحب بھی جنہیں ادبی دنیا جمیل عظیم آبادی کے نام سے جانتی ہے ایسے ہی کمیاب لوگوں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ہمارے معاشرے کے ایک عام آدمی کی حیثیت سے کیا۔ یعنی متوسط طبقے کے ایک فرد کی حیثیت سے تعلیم حاصل کی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت اختیار کر لی۔ ان کی ملازمت کا تعلق محکمۂ ٹیلی فون کے شعبۂ حسابات سے تھا جہاں سے وہ مدت ملازمت کی تکمیل کے بعد باعزت طور پر سبکدوش بھی ہوئے۔ ملازمت کے دوران وہ دیگر شعبوں کی طرف سے بالکل لاتعلق تو نہیں رہے لیکن ان سے سرگرم تعلق بھی نہیں رکھا۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنی ساری توجہ سرکاری ملازمت کے تقاضے پورے کرنے اور بچوں کی تعلیم وتربیت پر مرکوز رکھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی حیثیت سے پریکٹس کا آغاز کیا اور قابلِ رشک کامیابیاں حاصل کیں۔ اسی کے ساتھ فلاحی اور رفاہی کاموں میں دلچسپی لینی شروع کی اور متعدد اداروں اور تنظیموں کے عہدیدار کی حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ شعروسخن کی طرف بھی انہوں نے بھرپور توجہ مبذول کی اور شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کے علاوہ افسر ماہ پوری، سید قاری حبیب

اللہ اور صدیق فتح پوری صاحبان کے اشتراک سے ایک ادبی تنظیم مجلس احباب ملت کی داغ بیل ڈالی جس کے زیر اہتمام ہر ماہ طرحی نعتیہ مشاعرے اور سہ ماہی بہار یہ مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔

مجلسِ احباب ملت ہی کے تحت ہر ہفتے ان کی قیام گاہ پر ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع بھی نہایت پابندی سے ہوتا ہے جو کبھی رسمی ادبی نشست کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی غیر رسمی ملاقات اور باہمی تبادلۂ خیال کی۔ نشستیں رسمی ہوں یا غیر رسمی، جمیل عظیم آبادی ان نشستوں میں نہ صرف یہ کہ بھرپور حصہ لیتے ہیں بلکہ ان میں شرکت کرنے والے اہل قلم کی خاطر مدارات اور پذیرائی کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی قیام گاہ کو ایک ادبی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

جمیل عظیم آبادی مختلف جہتوں میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود مشق سخن سے کبھی غافل نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سولہ سال کے دوران ان کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو کہ مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں۔ اب تک ان کے شائع شدہ مجموعہ ہائے کلام علی الترتیب درج ذیل ہیں:

۱۔ دل کی کتاب (غزلیں ۱۹۸۴ء)، ۲۔ گیان درپن (دوہے گیت ۱۹۸۵ء)

۳۔ وحدت و مدحت (حمد و نعت ۱۹۸۷ء) ۴۔ آب و سراب (نظمیں ۱۹۹۲ء)

۵۔ گلہائے صد نگار (غزلیں ۱۹۹۷ء) ۶۔ گل سہ برگ (ثلاثی، ماہیے، ہائیکو ۱۹۹۷ء)

۷۔ الرحمٰن (حمدیں ۲۰۰۰ء) ۸۔ المدثر (نعتیں ۲۰۰۰ء)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا مجموعوں کے بعد بھی ان کے پاس اتنا کلام موجود ہے جس سے کئی اور مجموعے ترتیب پا سکتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ گاہے گاہے وہ ادبی مضامین اور تبصرے بھی لکھتے رہے اور اب انہوں نے نثر کی ایک اور صنف یعنی افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ دیا ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ گزشتہ سال جمیل صاحب اپنی ایک عزیزہ کی شادی میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد گئے تھے۔

چند دنوں کے بعد وہاں سے واپس آئے تو انکشاف کیا کہ اسلام آباد میں قیام کے دوران انہوں نے ایک افسانہ لکھا ہے جو وہ مجلس احباب ملت کی نشست میں سنانا چاہتے ہیں۔ سو انہوں نے یہ افسانہ ایک تنقیدی نشست میں سنایا جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ اس کے بعد نہایت تیز رفتاری کے ساتھ انہوں نے افسانے لکھنا شروع کر دیئے۔ ان میں سے کئی افسانے مختلف نشستوں میں سنائے اور کئی افسانے ادبی رسالوں میں شائع کرائے۔ دیکھتے دیکھتے ایک پورا مجموعہ تیار ہو گیا اور اب یہ مجموعہ طباعت و اشاعت کے مراحل میں ہے۔

یہ بات بہت واضح ہے کہ "روایت کے قیدی" میں شامل افسانے اصلاحی مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں۔ اصلاحی مقصد کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہا جائے مگر یہ حقیقت مسلم ہے کہ اردو فکشن یعنی ناول اور افسانے دونوں کا آغاز اصلاحی مقصد ہی کے تحت ہوا تھا اور اس کے بعد بھی ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں اصلاحی فکشن تخلیق کیا جاتا رہا۔

جمیل عظیم آبادی چونکہ ایک باشعور، حساس اور ذمہ دار انسان ہیں اس لئے وہ معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں، کوتاہیوں، یہاں تک کہ مذہب کے نام پر روا رکھی جانے والی بدعتوں کی نشان دہی اور ان کی اصلاح کی سعی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں سرسید احمد خاں نے اپنے مضمون "رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات" میں روایت کے نام پر معاشرے میں جاری و ساری برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ لینے کی تلقین کی تھی۔ جمیل عظیم آبادی نے بھی اپنے افسانوں کے ذریعہ یہی فریضہ انجام دیا ہے۔

ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ کئی پہلوؤں سے قابل غور اور قابل قدر ہے۔ اوّل اس اعتبار سے کہ ماشاء اللہ اسّی سال کی عمر میں نہ صرف یہ کہ وہ ادب تخلیق کر رہے ہیں بلکہ ایک نئی صنف میں طبع آزمائی کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں ورنہ عام طور پر لوگ اس عمر میں لکھنے لکھانے سے تائب ہو کر صرف اپنی پبلسٹی میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

دوم یہ کہ آج کل اختصاص کا زمانہ ہے۔ کسی ایک فن میں مہارت کافی سمجھی جاتی ہے

لیکن کچھ عرصہ پہلے تک ایسے لوگوں کو یک فنے ہونے کا طعنہ دیا جاتا تھا۔ جواہر لعل نہرو نے کولمبو یونیورسٹی کے کانووکیشن میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اختصاصی علم کی مذمت کی تھی جبکہ ابنِ انشا نے اپنے ایک کالم میں اس طرح کے ماہرین کا مذاق اڑایا تھا۔ جمیل عظیم آبادی افسانے لکھ کر یک فنے ہونے کے الزام سے بچ گئے ہیں۔

سوم یہ کہ جب بھی معاشرے کا درد رکھنے والے اور اس کی برائیوں کی جرأت کے ساتھ نشان دہی اور ان کی اصلاح کی کوششیں کرنے والوں کا ذکر کیا جائے گا تو اس میں ان کا نام ضرور شامل ہوگا۔

چہارم یہ کہ یہ افسانے عام لوگوں کے لئے لکھے گئے ہیں اور یہ عام پڑھنے والوں کے شعور میں یقیناً اضافہ کریں گے لیکن بعض پڑھنے والوں کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ کئی افسانوں میں افسانہ نگار نے عجلت پسندی سے کام لیا ہے۔ یہ عجلت پسندی دراصل جمیل عظیم آبادی کی فطرت کا حصہ ہے۔

پنجم یہ کہ عمرانیاتی مطالعے میں ان کے یہ افسانے ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ آج بھی اور آئندہ بھی۔

اور آخری بات یہ کہ اپنی مختلف صفات اور خدمات کی بناء پر جمیل عظیم آبادی کو ایک وسیع حلقے میں جو مرتبہ اور احترام حاصل ہے اس میں مزید اضافہ ہوگا۔

علی حیدر ملک ....

☆☆☆

جمیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری

جمیل عظیم آبادی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ حمد، نعت، غزل، نظم، گیت، دوہے اور ہائیکو غرض بہت سی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی فرما کر دنیائے ادب میں اپنے نام کا سکہ بٹھا چکے ہیں ۔ اب تک آٹھ شاعری کی کتابیں منظرِ عام پر آ کر اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں ۔ شاعری کے ساتھ وہ نثر نگاری کی طرف بھی رجوع ہوئے ہیں ۔ ''روایت کے قیدی'' چھبیس کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

''گلہائے صد رنگ'' کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

''راست گوئی میری عادت ہے اسی لئے میں جس طرح مشاہدہ کرتا ہوں یا محسوس کرتا ہوں، اسی طرح شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ میں اشعار میں مبالغہ آرائی کا قائل نہیں ہوں ۔ میں لفظیات اور جدیدیت کے چکر میں پڑ کر چیستاں گوئی کا مرتکب نہیں ہوا ۔ شعر گوئی کو ذریعۂ ابلاغ سمجھتا ہوں اس لئے چاہتا ہوں کہ میرے محسوسات قاری تک اسی آسانی سے منتقل ہو جائیں جیسا کہ میرے ذہن میں موجود ہیں۔''

میں نے یہ اقتباس اس لئے نقل کیا ہے کہ اس سے جناب جمیل عظیم آبادی کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ''روایت کے قیدی'' میں بھی انہوں نے اسی اندازِ بیان کو پیشِ نظر رکھا ہے ۔ ہر چند کہ ان کی شاعری یا نثر نگاری کسی تحریک کی پروردہ نہیں ہے مگر مندرجہ بالا بیان میں سر

سیّد کے طرزِ ادا کی گونج سنائی دیتی ہے:

"...... جہاں تک ہو سکا سادگی ادا پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسروں کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"

جمیل عظیم آبادی کی کہانیاں ان کے تجربات اور مشاہدات کی عکاس ہیں۔ شاعری کی طرح ان کہانیوں کا خمیر بھی غمِ حیات سے اٹھا ہے۔ ان میں زندگی کے دکھ سکھ، محبتیں، نفرتیں، رقابتیں لوگوں کے منافق رویئے، غرض زندگی کے مختلف روپ ہیں۔ ان کے کردار عام زندگی کے جانے پہچانے افراد ہیں۔ وہ زندگی کی سچی اور اصل تصویر مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کے بغیر پیش کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی وہ "لفظیات کے چکّر میں" نہیں پڑتے، حتیٰ کہ لفظوں کی تراش خراش اور فسوں بیانی کو بھی ضروری نہیں سمجھتے بلکہ نہایت سیدھے سادے انداز میں واقعات اور مشاہدات کو پیش کر دیتے ہیں۔

دراصل جمیل صاحب بنیادی طور پر ایک ہمدرد، شفیق، مہربان اور انسان دوست ہستی ہیں۔ وہ ایک حاذق طبیب بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دستِ شفا سے بھی نوازا ہے۔ ان کے گرد لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ "انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے۔" اس لئے نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں اور ماہر غواص کی طرح دریائے دل میں اُتر کر نایاب موتی چن لاتے ہیں۔ جسم کی بیماریوں سے گزر کر روح کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، اداس اور مضمحل چہروں پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھتے ہیں، غیر متوازن دھڑکنوں سے فردکی زندگی کے فرسٹریشن (Frustration) تک پہنچ کر کوئی نہ کوئی کہانی نکال لاتے ہیں۔ زندگی کے انہیں "گلہائے صدرنگ" سے "دل کی کتاب" مرتب کر لیتے ہیں۔

ہومیو پیتھک طریقۂ علاج میں بقول جمیل صاحب مرض کے علاج کے لئے مریض کی ہر کیفیت اور سوچ سے آگہی ضروری ہے، اس میں محض اس مرض کا علاج نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے یا جس کے علاج کے لئے مریض آتا ہے کیونکہ اصل مرض نظر نہیں آتا اور اس وقت تکلیف دینے والا

مرض اصل مرض کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ مریض سے گفتگو کرتے ہیں اور دورانِ گفتگو اس کی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں مختلف افراد کے گرد گھومتی ہیں۔ ان میں جمیل صاحب کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے میں انہیں خصوصی مبارک باد پیش کرتی ہوں کہ انہوں نے مختلف افراد کی روداد کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور سمجھانے میں معاونت کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ بیماریاں فرد کی زندگی پر بار بار حملہ آور ہوتی ہیں، ان کے تدارک کی صورتیں موجود ہیں مگر لوگ دھیان نہیں دیتے۔ ان میں جسمانی بیماریاں بھی ہیں اور نفسیاتی بھی۔ مثلاً ''کھوٹا سکّہ'' میں ساس اپنی بہو کو اولاد نہ ہونے کا سبب قرار دیتی ہے مگر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ خامی اس کے اپنے بیٹے میں ہے تو بہو کے ساتھ اس کا رویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ ''روایت کے قیدی'' میں بھی ایسے ہی ایک مسئلے کو پیش کیا گیا ہے کہ بعض اوقات والدین کی غلط سوچ کا شکار ہو کر زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ روایتیں قائم رہتی ہیں مگر زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے۔ ''فتویٰ'' میں بھی حنفی مسلک کے تحت طلاق کے موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔

جمیل عظیم آبادی کی کہانیوں کی خوبی ہی یہی ہے کہ یہ عام زندگی کے بہت ہی عام واقعات ہیں مگر ان میں مختلف مسئلوں کو پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہانی بُننے سے زیادہ مقصدیت کی طرف توجہ دی ہے۔ بعض کہانیوں میں خیر اور شر کے موضوعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ خیر کی جزا اور شر کی سزا مل کر رہتی ہے۔ مثلاً ''دیر ہے اندھیر نہیں'' میں ایک صابر، دیانت دار اور فرض شناس کردار فرید احمد کو صبر اور ایمانداری کا پھل اسی دنیا میں ملتا ہے۔ کہانی ''لے پالک'' ایک اہم مسئلے کا حل پیش کرتی ہے کہ نکاح کے وقت نکاح نامے میں ولدیت کے خانے میں نامعلوم لکھ کر والدین میں پالنے والوں کے نام لکھ دیئے جائیں تو شرعی اعتبار سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا کیونکہ لاوارث بچوں کی صورت میں والدین کے خانے میں پالنے والوں کے نام نہیں لکھے جاسکتے۔

''جوڑے آسمان پر بنتے ہیں'' میں نفسا نفسی اور خود غرضی کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک بیوہ

بہن اپنی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں بھائی سے معلومات کے لئے کہتی ہے، وہ غلط بیانی سے کام لے کر رشتہ ختم کرا دیتا ہے لیکن اسی لڑکے کو اپنی بیٹی کے لئے پسند کر لیتا ہے۔ بہن کے استفسار پر ڈھٹائی سے جواب دیتا ہے کہ ''جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔''

''فرض'' بھی ہمارے معاشرے کی ایک دکھتی رگ کی کہانی ہے جہاں سوتیلی ماں کے ظالمانہ رویئے سے تنگ آ کر بچے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ باپ بھی فرض کی ادائیگی بھول جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آڑے وقت میں بیٹا خون کے رشتے کا بھرم رکھ لیتا ہے اور فرض سے کوتاہی نہیں برتتا۔

''بوجھ'' بھی اسی خود غرض معاشرے کی کہانی ہے جہاں تمام رشتوں کی بنیاد مالی حقیقت اور رواں دواں زندگی پر ہوتی ہے۔ ایک معذور انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ نام نہاد اپنوں سے دور دوبارہ لندن جا کر اپنا گزارا الاؤنس جاری کرا لے۔

''سبز قدم'' میں ایک منفی سوچ کو پیش کیا گیا ہے کہ لڑکی کی شادی کے بعد اگر خاندان میں پے در پے اموات اور حادثات ہونے لگیں تو اسے سبز قدم قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے لیکن اس کہانی میں وہی لڑکی ایک روز معاشرے میں بلند مقام حاصل کر لیتی ہے اور اسے سبز قدم قرار دینے والی ساس اس کے در پر ملازمت کے لئے آ کر یہ اعتراف کرتی ہے کہ ''میری سمجھ میں اب آیا کہ سبز قدم کوئی انسان نہیں ہوتا، یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں۔''

جناب جمیل عظیم آبادی اپنی کہانیوں کو ایک منطقی انجام تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا مقصد اپنے قارئین تک ایک خاص پیغام پہنچانا ہے چنانچہ بہت سی کہانیوں کا اختتام حتمی طور پر ہوا ہے۔

جمیل عظیم آبادی زندگی کے مختلف رخوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایسے سوال ابھارتے ہیں جو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ بعض واقعات میں اپنا محاسبہ آپ کرنے کی سوچ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ''مکافاتِ عمل''، ''کفارہ''، ''خودرو''، ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔

''انتظار'' میں حساس بچوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ ایسے بچے ناروا انداز میں روک ٹوک پسند نہیں کرتے اور دل گرفتہ ہو کر گھر بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ والدین واپسی کی آس میں زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ اس کہانی میں ایسی ہی ایک ماں چھ ماہ کے طویل انتظار کے بعد بالآخر

جاں سے گزر جاتی ہے۔

''انا کی بھینٹ'' ہمارے معاشرے کی ایک سچی تصویر ہے۔ ہمارے یہاں لڑکے اور لڑکے والے اپنے آپ کو لڑکی اور لڑکی والوں سے برتر سمجھتے ہیں، سو لڑکیوں کو رد کر کے کہیں ایک لڑکی پسند آتی ہے جبکہ لڑکی کو اس کی اجازت نہیں ہوتی مگر آج کل لڑکیوں کی شرح خواندگی میں تیزی سے اضافے کے بعد ثابت ہو چکا ہے کہ بعض لڑکیوں کی ذہنی سطح لڑکوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اکبر بھی بہت سی لڑکیوں کو رد کر دینے کے بعد امریکہ میں بسنے والی ایک لڑکی سے تبادلۂ خیال کے بعد پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے مگر لڑکی یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ لڑکا اس کے معیار پر پورا نہیں اترا۔ اکبر کے لئے یہ غیر متوقع بات تھی، وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکا اور خودکشی کر لیتا ہے۔

کبھی کبھی ایک انجانی خوشی انسان کی پوری شخصیت اور رویئے میں تبدیلی کا سبب بن جاتی ہے۔ ''خواب کی تعبیر'' میں بیگم تنویر کی زندگی میں ایک خوشگوار خواب نت نئے رنگ بھر دیتا ہے۔ منفی سوچ، مثبت انداز اختیار کر لیتی ہے اور پانچ سال کے بعد وہ ماں بنتی ہیں۔ چھوٹی سی اس کہانی سے ایک طبی نکتے کو پیش کیا گیا ہے کہ بعض اوقات اولاد نہ ہونے کی وہ کوئی نفسیاتی گرہ بھی ہوتی ہے۔ جیسے ہی یہ دباؤ دور ہوتا ہے مرض خود بخود جاتا رہتا ہے۔

''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' میں بھی کہانی سے ہٹ کر بعض بچوں کی ایک خاص بیماری کا ذکر ہے جو نیند میں بستر گیلا کر دیتے ہیں۔ اس کا سبب کوئی نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے، بے جا سختی کی جگہ پیار اور نرمی سے اس مرض کا تدارک ممکن ہے۔

''روایت کے قیدی'' کے آخری چار افسانے جانوروں کی جبلت اور نفسیات پر ہیں۔

''عربی نسل کا گھوڑا'' ایک خوبصورت کہانی ہے۔ بعض رؤساء اپنی انا کی تسکین کے لئے نادر اور اعلیٰ نسل کے جانور پالنے کے شوقین ہوتے ہیں لیکن وہ ان کی سرشت اور فطرت کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ ہاں ان کی جسمانی نشوونما کا خیال ضروری ہے وہاں ان کی خصوصیات کا لحاظ بھی لازمی ہے۔ بے لوث اور بے غرض چاہنے والے بے زبانوں کی محبت پر اگر شک کیا جائے تو وہ دل گرفتہ ہو کر جان دے دیتے ہیں۔ گھوڑے اور کتے کی وفاداری مشہور ہے۔

''ٹومی'' میں بھی ایک کتے کی وفاداری کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی جان پر کھیل کر مالک کو بچا لیتا ہے۔ ان دونوں کہانیوں میں ''عربی نسل کا گھوڑا'' ایک منفرد کہانی ہے۔

''مٹھو'' ایک بولنے والا طوطا ہے جسے اور باتوں کے علاوہ گھر کے ہر فرد کے نام صورتوں کے ساتھ یاد ہیں۔ اسی لئے جب ایک پرانا ملازم افرادِ خانہ کی غیر موجودگی میں چوری کرتا ہے تو اسے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایک معمولی سا مٹھی بھر پرندہ چشم دید گواہ بن کر اس کے نام کی یوں رٹ لگائے گا کہ وہ خود جرم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

''سانپ اور سپیرا'' بھی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ ڈسنا سانپ کی جبلت ہے۔ اسی کے تحت ایک دن اپنے پالنے والے سپیرے کو بھی ڈس لیتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ یات بھی دلچسپ ہے کہ انتقام انسانی جبلت میں بھی شامل ہے۔

جناب جمیل عظیم آبادی دو ہجرتوں کے کرب سے گزرے ہیں۔ مگر میں نے ان کی طرح باہمت اور باحوصلہ شخصیت بہت کم دیکھی ہے۔ وقت نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ دوسری ہجرت کے بعد انہوں نے نئے سرے سے اپنے آپ کو تلاش کیا اور ابھی تک اپنی ذات کی تلاش کے سفر میں ہیں۔ وہ ''رہ نوردِ شوق'' ہیں جو کسی منزل پر پڑاؤ نہیں ڈالتے۔ ''ہر لحظہ نئی آن، نئی شان'' سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے، وہ اسی طرح دکھی انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرتے رہیں۔

............(پروفیسر) شہناز پروین

☆☆☆

میری کہانی

میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور میں بنیادی طور پر شاعر ہی ہوں جس کے ثبوت میں میرے آٹھ شعری مجموعۂ کلام منصۂ شہود پر موجود ہیں۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری، دونوں کے محرکات ایک ہیں۔ دونوں اظہارِ خیال کے ذرائع ہیں۔ شاعر یا افسانہ نگار اپنے ماحول اور اپنے اردگرد کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر اشعار کہتا ہے یا واقعہ نگاری کہانی کی شکل میں کرتا ہے۔ لکھنے والے کا واحد مقصد اپنے محسوسات و جذبات کو ابلاغ دینا ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو کیفیات اس کے دل و دماغ پر مرتب ہوتے ہیں ان کی ترسیل دوسروں تک ہو جائے۔ شاعری اور افسانہ نگاری دونوں ذریعہ ابلاغ میں فرق اندازِ بیان کا ہوتا ہے۔

انسان کسی ایک ڈگر پر چلتے چلتے عموماً تھک کر بیٹھ جاتا ہے یا راہ بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اسلام آباد یکم اگست ۲۰۰۲ء کو اپنی نواسی کی شادی کے سلسلے میں کراچی سے گیا ہوا تھا۔ ۲؍اگست کو حسب معمول میں علی الصباح بیدار ہوا اور نماز سے فارغ ہو کر کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ صبح کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ موسم کا لطف لیتے ہوئے کچھ اشعار کہنے کی کوشش کی لیکن عجب اتفاق کہ آدھے گھنٹے کی کوشش کے باوجود نہ کسی غزل کا مطلع ہوا اور نہ ہی کسی نظم کا عنوان ذہن پر مرتب ہوا۔ آخر اکتا کر یا زچ ہو کر میں بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھ لگ گئی اور اسی عالم غنودگی میں ایک کہانی جو غالباً تحت الشعور میں موجود تھی، فلم کی طرح گردش کرنے لگی اور آغاز تا انجام میں اس کہانی کا سامع بنا رہا۔ کہانی کے اختتام پر آنکھ کھل گئی اور میں نے فوراً اس کہانی کو قلم و

قرطاس پر منتقل کرلیا اور وہ کہانی ''کفارہ'' مرتب ہوگئی۔ دوسرے دن بھی یہی کیفیت رہی اور کہانی ''فتویٰ'' مرتب ہوگئی۔ تیسرے دن بھی یہی حال رہا لیکن کہانی مکمل نہ ہوسکی۔ مجھے کراچی واپس لوٹنا تھا لہٰذا اس کہانی ''خودرو'' کو کراچی آکر مکمل کیا۔

میں نے جب احباب ہم نشیں سے ذکر کیا اور کہانیاں سنائیں تو دوستوں نے، جن میں جیّد افسانہ نویس بھی تھے، میری ہمت افزائی کی اور کہا کہ ساری کہانیاں مکمل ہیں اور قابل غور ہیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ کہانی لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اس طرح ایک شاعر کہانی نویس بن گیا۔ کہانی لکھنے کا جو سلسلہ چل پڑا تو بہت ہی کم عرصے میں اتنی کہانیاں ہوگئیں کہ اب انہیں کتاب کی شکل دے کر قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔ ''روایت کے قیدی'' میں کہانیاں کیسی ہیں، یہ کام ہمارے دانشوروں کا ہے جو ان کہانیوں کے محاسن ومعائب پر اپنی آرا سے سرفراز فرمائیں گے۔

افسانہ، کہانی کا دوسرا نام ہے۔ افسانہ زندگی کے حالات و واقعات کو سہل اور سادہ الفاظ میں پیش کرنے کا نام ہے۔ افسانہ انسان کے دکھ سکھ، معاشرے کی زبوں حالی اور خوش حالی کو اس کے صحیح تناظر میں قاری تک پہنچانے کا نام ہے۔ افسانہ حقیقت اور تخیل کی آمیزش سے تشکیل پاتا ہے۔ میرے خیال میں افسانہ نگاری میں بیان کی سچائی اور جذبات کی دل آویزی ہونی چاہئے لیکن ہمارے عہد کے بیشتر افسانہ نگار حقیقت کم بیان کرتے ہیں اور اپنی ذہنی اختراع سے زیادہ کام لے کر افسانے پیش کرتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں اکثر نہ ڈھنگ کی کہانی ہوتی ہے، نہ کردار اور اگر افسانہ علامتی ہوا تو پڑھنے والے کے ذہن کی ورزش الگ ہوتی ہے۔

میں اپنی کہانیوں کو افسانہ یا فکشن کہنے سے گریز کررہا ہوں کہ کہانی یا داستان ہمارے ادب میں روز اول سے موجود ہے اور فکشن یا افسانہ مغرب سے درآمد شدہ ہے جن میں واقعات اور ماجرائیت کی کمی ہوتی ہے۔ ''روایت کے قیدی'' کی ہر کہانی واقعیاتی ہے جس کا پس منظر حقیقت پر مبنی ہے۔ صرف نام ومقام اور واقعات میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ساری کہانیاں پیش کی گئی

ہیں۔ ساری کہانیوں کو میں نے راست انداز میں سادگی اور صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساری کہانیاں ہمارے معاشرے کی پیداوار ہیں جن کو ابلاغ دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ کہانیاں پڑھ کر دوسروں کو بھی جراٗتِ اظہار ہو اور معاشرے کی زبوں حالی پر قلم اٹھائیں۔

میں مدیرانِ گرامی جناب ڈاکٹر حنیف فوق (ماہنامہ ''افکار'' کراچی)، جناب نسیم درّانی (''سیپ'' کراچی)، جناب محمود واجد (ماہنامہ ''آئندہ'' کراچی)، جناب نقوش نقوی (ماہنامہ ''سخنور'' کراچی)، جناب احمد زین الدین (سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی) اور جناب حبیب احسن (''خیال'' کراچی) کا ممنون ہوں کہ میری کہانیوں کو اپنے جریدوں میں جگہ دی جو میری حوصلہ افزائی کا سبب بنے۔

میں کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں جناب اے خیام کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے کتابت تا اشاعت ساری ذمہ داری اپنے سر لے کر میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں محترم خواجہ منظر حسن منظر کا بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے کتابت شدہ مسودہ کو بغور پڑھا اور کمپوزنگ کی خامیوں کی نشاندہی فرمائی۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے لئے انہوں نے دو عدد قطعہ تاریخ عنایت کی۔ میں محترمہ پروفیسر شہناز پروین اور پروفیسر علی حیدر ملک کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بڑی توجہ سے کہانیاں پڑھیں اور اپنی آرا تحریر کیں۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

جمیل عظیم آبادی ....

☆☆☆
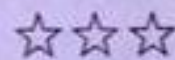
روایت کے قیدی

معلوم ہوا کہ ناصر جو میرے بچپن کا دوست تھا، بیمار ہے۔ میں نے ٹیلی فون کیا تو اس کے ملازم نے جواب دیا کہ اس وقت وہ سو رہے ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اس کی عیادت کو اس کے گھر چلا گیا۔

''ناصر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یار ہونا کیا تھا، بس بڑھاپے کا اثر ہے۔ کمزوری بہت ہے اور کئی دنوں سے بستر پر پڑا ہوا ہوں۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا کھا رہا ہوں۔''

گھر کی اداسی اور خاموشی کو دیکھ کر میں نے کہا۔ ''ناصر، اگر تو نے شادی کر لی ہوتی تو گھر میں اتنی اداسی نہ ہوتی۔ پوتے پوتیوں سے گھر میں رونق ہوتی۔''

''یہ سب قسمت کی بات ہے۔'' ناصر نے اداسی سے کہا۔

''میں تیرا قریبی دوست ہوتے ہوئے بھی یہ نہ جان سکا کہ تو نے شادی کیوں نہیں کی۔ آج مجھے بتانا ہوگا۔'' میں نے اصرار کیا۔

''یہ بڑی طویل کہانی ہے۔ تو سن کر بور ہوگا۔'' ناصر نے ٹالنا چاہا۔

''ناصر، آج کل میں کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ اگر تو مجھے اپنی کہانی سنا دے تو میری کہانیوں کے

ذخیرے میں ایک اضافہ ہو جائے گا۔"

"چل تو بھی کیا یاد کرے گا۔ اٹھا کاغذ قلم اور لکھ۔"

ناصر نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔"میں لائبریری میں کتب بینی میں مشغول تھا کہ یکا یک لوگوں کی بھیڑ لائبریری میں در آئی۔ شور وغل سے دھیان لائبریری کے دروازے کی طرف گیا۔ میں اپنی نشست سے اٹھ کر دروازے تک گیا کہ شور وغل کی وجہ جان سکوں۔ معلوم ہوا کہ یکا یک آسمان سے رحمت کا نزول ہوا ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ لوگ پناہ لینے لائبریری میں گھس آئے ہیں۔ فضا تو صبح سے ہی بہت خوشگوار تھی اور بارش کا امکان موجود تھا۔ لائبریری کے کمرے سے نکل کر جب برآمدے میں آیا تو میری نظر اظہر پر پڑی۔ میں نے اسے آواز دی۔ اظہر نے کہا بھیا میں سامنے ہسپتال سے آ رہا ہوں، ہسپتال سے نکلا ہی تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور یہاں پناہ لینی پڑی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔"خیریت تو ہے، ہسپتال کس لئے گئے تھے۔"

اظہر نے کہا۔"امی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی، وہ ہسپتال میں داخل ہیں۔"

میں نے اظہر سے ہسپتال کا پتہ پوچھا۔ اس نے کمرہ نمبر وغیرہ بتایا۔ میں پھر لائبریری میں آ گیا اور مطالعے میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دیر بعد بارش کا زور ٹوٹا اور لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے اور لائبریری خالی ہونے لگی۔ میں بھی باہر آیا اور اپنی موٹر سائیکل پر ہسپتال پہنچ گیا۔ کمرہ نمبر ۲۲۰ جو دوسری منزل پر تھا، پہنچ کر دروازے پر دستک دینے کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے سلام کیا اور پوچھا کہ کیا مظہر چچا کی بیگم اسی کمرے میں ہیں۔ انہوں نے مجھے اندر بلا لیا۔ میں اندر گیا، چچی کی خیریت پوچھی۔

انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ مظہر صاحب کے دوست کا لڑکا ہے۔ بہت ہی نیک اور ہمدرد ہے۔ میرے لئے یہ میرے اظہر کی طرح ہے۔"

مجھ سے کہا۔ ''یہ میری منجھلی آپا ہیں۔ میری بیماری کی خبر سن کر میری بڑی آپا اور منجھلی آپا دونوں آئی ہوئی ہیں۔''

میں کچھ دیر بیٹھا اور پھر اجازت لے کر چل پڑا۔ ابھی دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ چچی نے آواز دی۔ میں پلٹ کر ان کے بستر کے قریب پہنچ گیا۔

چچی کہنے لگیں۔ ''میں تمہیں ایک ذمہ داری دینا چاہتی ہوں، امید ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ حکم دیں، مجھے کیا کرنا ہے۔''

انہوں نے کہا۔ ''منجھلی آپا کی ایک بیٹی ہے صباحت، جو میٹرک میں پڑھتی ہے، وہ ان کے ساتھ ہی آگئی ہے۔ وہ ٹیوشن پڑھ رہی تھی لیکن ڈیڑھ دو مہینے کے لئے کہاں ٹیچر ڈھونڈوں۔ اگر تم اسے پڑھا دیا کرو تو بہت مناسب رہے گا۔''

میں نے کچھ دیر سوچا پھر حامی بھر لی۔ لیکن میں نے بتا دیا کہ مجھ سے پابندی نہیں ہو سکے گی۔ جب موقع ہوگا، دیکھ لیا کروں گا۔ دونوں بہنوں نے دعائیں دیں اور ممنونیت کا اظہار کیا۔

میں ہسپتال سے نکلا اور سیدھا مظہر چچا کے گھر گیا۔ ایک معمر خاتون نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو اظہر نے سن لیا اور آواز دی۔

''بھیا اندر آجایئے۔''

وہ خود بھی دروازے پر آگیا۔ میں اندر گیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا اور اظہر سے کہا کہ چچی نے تمہاری منجھلی خالہ کی بیٹی صباحت کو پڑھانے کے لئے کہا ہے۔

اظہر نے آواز دی۔ ''صباحت آپا آیئے، آپ کے ماسٹر صاحب آئے ہیں۔''

اس آواز پر صباحت تو نہ آئی مگر ان کی بڑی خالہ نمودار ہوئیں اور پوچھا۔ ''صباحت کو کیوں بلا رہے ہو۔''

اظہر نے انہیں مقصد بتا دیا۔

محترمہ نے کہا۔'' آج یہ نہیں ہوسکتا۔ جب تک میں صباحت کی ماں سے پوچھ نہ لوں، میں اجازت نہیں دے سکتی۔''

میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ جب وہ مناسب سمجھیں مجھے اطلاع دے دیں۔ دو دنوں تک کوئی خبر نہ آئی۔ میں بھی خوش ہوا کہ چلو بلا ٹلی۔ تیسرے دن جب پھر چچی کو دیکھنے ہسپتال گیا تو انہوں نے پوچھا تم ڈیوٹی دے رہے ہو۔

میں نے کہا۔'' آپ کی بڑی آپا نے اجازت نہیں دی۔''

انہوں نے پاس بیٹھی اپنی منجھلی آپا کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ خاموش رہیں۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن شام کو جب گھر لوٹا تو میری آپا نے بتایا کہ منظہر چچا کے گھر سے ٹیلی فون آیا تھا، تاکید سے تمہیں بلایا ہے۔ میں خاموش رہا۔ دوسرے دن صبح کو جب میں ناشتہ کر رہا تھا تو اظہر کا ٹیلی فون آیا۔

اس نے کہا۔'' بھیا آپ پڑھانے آجایئے۔''

میں نے کہا۔'' تم پہلے اپنی بڑی خالہ سے بات کراؤ۔''

محترمہ نے کہا۔'' بیٹا پڑھانے آجاؤ، میں نے صباحت کی ماں سے پوچھ لیا ہے۔''

حسب وعدہ میں دوسرے دن شام کو پہنچا۔ گھر میں صرف بڑی خالہ اور صباحت موجود تھیں۔ میں نے پہلی بار صباحت کو دیکھا۔ لڑکی جاذب نظر، چنچل آنکھیں، کھلتا ہوا گلابی رنگ اور بہت سی خوبیوں کی سراپا لگی۔ میں نے رسمی گفتگو شروع کی تاکہ اس کی علمی اور ذہنی استعداد کا اندازہ لگا سکوں۔ اس دن تو میں صرف کتاب کاپی کا مشورہ دے کر چلا آیا۔ دوسرے دن سے پڑھائی شروع ہوئی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ روزانہ سر کھپانا پڑ رہا تھا۔ دو ہفتے کے بعد سلسلہ تیز رفتاری سے چل پڑا اور حیرت انگیز تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ اب وہ حساب ایک اشارے میں سمجھنے لگی اور دوسرے مضامین بھی سمجھنے لگی۔ صحیح لگن ہو تو مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔

چار ہفتے پڑھائی کے بعد عجیب و غریب تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ پڑھنے سے دھیان

اٹھتا گیا۔ پڑھائی کے وقت کوئی نہ کوئی موجود ہوتا اس لئے پڑھائی کے سوا اور کوئی دوسری بات کا امکان نہیں تھا۔ کاپی میں کبھی لکھا ہوا ملتا How sweet you are، یا آپ بہت اچھے ہیں، اسمارٹ ہیں، آپ کی شخصیت میں جاذبیت اور کشش ہے وغیرہ۔ میں ان تحریروں کو دیکھ کر کھولنے لگتا لیکن غصے کا اظہار بھی ممکن نہ تھا۔ میں نے موقع پا کر دھیمے لہجے میں کہا شاید تمہاری پڑھائی اب ختم ہوگئی ہے، تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔ کل سے میں نہیں آؤں گا۔ اس کے چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہوئے، اس نے آہستہ سے کہا، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ کچھ دن اور بہ حسن و خوبی گزر گئے۔

ایک دن موسمِ برشگال شباب پر تھا۔ دن بھر رم جھم ہوتی رہی۔ شام کو مطلع صاف ہوگیا اور میں حسب پروگرام پڑھانے پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تیز بارش شروع ہوگئی، رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ یہاں تک کہ رات کے دس بج گئے۔ گھر جانے کو سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک آواز آئی سب لوگ کھانے کی میز پر آجائیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے سب لوگ چلے گئے۔ میں تنہا بیٹھا رہا لیکن فوراً ہی اظہر آیا اور کہا بھیا کھانے پر آپکا انتظار ہو رہا ہے۔ میں نے کہا گھر جا کر کھانا کھاؤں گا لیکن اس نے اصرار کیا اور صباحت اور ان کی والدہ بھی آگئیں اور مجھے ان کے ساتھ کھانے میں شامل ہونا ہی پڑا۔ کھانے کے بعد سب لوگوں نے کہا اس وقت اتنی تیز بارش میں جانا ممکن نہیں، رات وہیں بسر کرلوں۔ بات مناسب تھی۔ میں نے آپا کو ٹیلی فون کر دیا۔

ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی مہمانوں کا کمرہ تھا۔ اظہر اور صباحت بھی کمرے میں آگئے اور رات دیر گئے تک باتیں کرتے رہے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ لوگ گئے تو میں نے لائٹ بجھائی اور سونے کی کوشش کرنے لگا اور نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی۔ بارش کا شور اور جھینگر اور مینڈک کی آوازوں نے عجب مسحور کن فضا بنا رکھی تھی۔ میں محوِ خواب تھا کہ یکایک کمرے میں کسی کے چلنے کی آواز محسوس ہوئی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا کون؟ آواز آئی شور مچانے کی ضرورت نہیں، میں ہوں صباحت۔ میں نے اٹھ کر فوراً کمرے کی لائٹ جلادی۔ وہ میرے پلنگ

سے لگی کھڑی تھی۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، اس وقت صبح کے چار بج رہے ہیں، تم نے اس طرح میرے کمرے میں آنے کی ہمت کیسے کی۔ اس نے بڑی بیباکی سے کہا، یہاں لوگ صبح آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھتے۔ میں تو غسل خانے ضرورتاً آئی تھی۔ چونکہ اس غسل خانے کا ایک دروازہ آپ کے کمرے میں کھلتا ہے، جو کھلا ہوا تھا تو میں نے سوچا آپ تنہا بور ہو رہے ہوں گے اس لئے چلی آئی۔ میں نے کہا تمہاری یہ حرکت بدنامی اور رسوائی کا سبب بن سکتی ہے۔ تم فوراً اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ جانے کی بجائے وہ میری پلنگ پر بیٹھ گئی اور جذباتی انداز میں میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر کمرے سے چلی گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اس کے ایک بوسے نے ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی اور میں ایک اضطراب کے عالم میں اس حادثے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح کے چھ بج گئے۔

بارش تھم چکی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھا اور چپکے سے اپنی موٹر سائیکل نکالی، دروازہ بند کیا اور گھر آ گیا۔ اس روز میں دفتر نہیں گیا، بلکہ سوتا رہا۔

اس واقعہ کے بعد میں کئی دن تک مظہر چچا کے یہاں نہیں گیا اور نہ وہاں سے کوئی بلاوا آیا۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد صباحت کا ٹیلی فون آیا کہ آپ نے آنا کیوں چھوڑ دیا، کیا آپ خفا ہیں؟ پھر بولی کہ آج آپ ضرور آئیں، دو تین دن بعد ہم لوگ واپس جانے والے ہیں۔ میں اس دن تو نہیں گیا، دوسرے روز شام کو گیا۔ چچی نے رسماً پوچھا کہ اتنے دن کہاں غائب رہے۔ میں نے کہا کہ بارش میں بھیگ جانے کے باعث زکام ہو گیا تھا اس لئے آنا نہ ہو سکا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صباحت اور اس کی والدہ دو تین دن بعد چلی جائیں گی، اس کے والد انہیں لینے آ رہے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں چلا آیا۔ دوسرے دن جب میں دفتر سے آیا تو آپا نے کہا مظہر چچی کا ٹیلی فون آیا تھا تمہیں تاکید سے بلایا ہے۔ میں نے کہا کل ہی تو میں گیا تھا آج کیا خاص ضرورت آن پڑی۔ خیر تھوڑی دیر بعد میں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صباحت کے ابا کو فرصت نہیں ملی اور صباحت اور ان کی والدہ کو فوراً بلایا ہے۔ چچی نے کہا اس وقت تو کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا جس

کے ساتھ ان لوگوں کو بھیج دوں۔ میں نے اسی لئے تمہیں بلوایا ہے کہ تم مہربانی کر کے ان لوگوں کو چھوڑ آؤ۔ میں نے کہا دفتر چھوڑ کر جانا تو مشکل ہے لیکن ان لوگوں کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے میں نے ہفتہ کی شام کو جانے کے لئے آمادگی ظاہر کر دی تا کہ پیر کی صبح تک واپس آسکوں۔ ہفتے میں دو دن باقی تھے۔ حسب پروگرام میں نے ان لوگوں کو پہنچا دیا۔ صباحت کے والد سے ملاقات ہوئی۔ بڑے روکھے قسم کے انسان معلوم ہوئے۔ کم گو اور گفتگو میں لئے دیئے رہنے والے۔ واپسی سے قبل صباحت سے تنہائی میں ملاقات کا موقع ملا۔ اس نے کہا میں آپ سے بہت متاثر ہوں۔ برا نہ مانئے۔ آپ میرے لئے ہمدردی کا کوئی گوشہ ضرور رکھیں۔ ایک رومال کا حقیر سا تحفہ قبول کریں۔ یہ رومال میری یاد دلاتا رہے گا۔ میں خاموش سنتا رہا اور رومال کا شکریہ ادا کیا۔

وہاں سے آنے کے بعد عجیب سی کیفیت رہی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے دل و دماغ پر صباحت ہی چھائی رہی۔ دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی میں اس کیفیت سے نہ نکل سکا۔ ادھر صباحت کی کوئی خیریت بھی معلوم نہیں ہوئی۔ نہ کوئی آیا نہ خط ہی موصول ہوا۔ اسی بے اطمینانی اور کشمکش میں تھا کہ ایک دن اظہر آیا اور مجھے ایک خط دے گیا۔ کہنے لگا میں منجھلی خالہ کے یہاں گیا تھا صباحت آپا نے آپ کو یہ خط دیا ہے۔ اظہر کے جانے کے بعد میں نے خط کھولا۔

"جانِ تمنا!

میرا امتحان ختم ہو گیا۔ امید ہے کہ پاس ہو جاؤں گی۔ امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے پہلے یاد نہ کر سکی۔ میری کشتی کو ناخدا کی ضرورت ہے۔ کاش آپ کا سہارا مل جائے۔

اگر جواب دینا پسند کریں تو پتہ درج ذیل ہے۔

فقط آپ کی

صباحت

اس خط کو پڑھنے کے بعد میری کیفیت میں ہیجان اور بڑھ گیا۔ میں کھویا کھویا رہنے لگا۔ آپا کو میری کیفیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ انہوں نے میری پریشانی کا یہ حل نکالا کہ میری شادی کر

دی جائے۔ والد صاحب سے مشورہ کے بعد مجھ سے کہا اب تمہاری شادی ہونی چاہئے۔ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا۔ شادی کی باتیں ہونے لگیں تو خیال آیا کہ صباحت کے بارے میں ہی کیوں نہ بات چھیڑی جائے۔ لیکن کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

ایک دن دولہا بھائی نے مجھ سے کہا چلو قلفی کھائی جائے۔ میں آمادہ ہو گیا۔ دولہا بھائی نے کہا میاں قلفی کھانے کا تو ایک بہانہ ہے۔ دراصل تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم شادی سے گریز کیوں کر رہے ہو۔ اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے تو بتاؤ۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے صباحت کی طرف اشارہ کیا۔ دولہا بھائی نے آپا سے ذکر کیا ہوگا، انہوں نے مجھ سے تصدیق چاہی تو میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ آپا نے میری رائے کو والد صاحب کے گوش گزار کیا۔ والد صاحب سنتے ہی چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے مظہر میرا دوست ہے، وہ میرا بھائی نہیں ہے۔ اس سے میرا خونی رشتہ نہیں ہے۔ میں اپنے اجداد کی روایت کو شرمندہ نہیں کروں گا۔ میں غیر کفو میں رشتہ نہیں کروں گا۔ تم ناصر کو سمجھا دو۔ وہ عقل کے ناخن لے۔ میری زندگی میں اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی برادری میں شادی کرے اور یہ لیلیٰ مجنوں کا کھیل چھوڑ دے۔ مجھ میں یہ جرأت کہاں کہ والد صاحب کی نافرمانی کرتا لیکن میں نے عہد کر لیا کہ شادی کروں گا تو صباحت سے ہی، وہ میری محبت تھی۔ صباحت کو بتا دیا کہ ایں خیال محال است۔ اس نے بھی عہد کر لیا کہ شادی اگر کرے گی تو ناصر سے۔ اس عہد و پیماں کے بعد دونوں کو صبر آ گیا۔

پاسبان روایت کی موجودگی میں تکمیلِ آرزو ناممکن تھی۔ اور جب پاسبان روایت کوچ کر گئے تو دونوں کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ ایسی صورت میں ایک دوسرے سے رشتہ میں منسلک ہونا بہت بڑا مذاق ہوتا۔ صباحت بھی اسکول سے ریٹائر ہو گئی اور میں بھی اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو گیا اور دونوں پچاس سال سے روایت کے قیدی بن کر عمر قید کاٹ رہے ہیں۔"

ناصر کی کہانی سننے کے بعد میں بہت دیر تک کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

☆☆☆

کفّارہ

حسبِ معمول ناشتے کی میز پر سیٹھ سلطان، ان کی بیگم اور ان کا بیٹا اسد کھانے میں مشغول تھے۔ یکا یک آواز گونجی۔

''پاپا آپ مجھے موٹر سائیکل دلا دیں۔'' اسد نے اپنے والد سیٹھ سلطان کو مخاطب کر کے کہا۔
سیٹھ سلطان چونک اٹھے۔ ''تمہارے پاس تو موٹر کار ہے جس پر تم روزانہ کالج جاتے ہو۔ پھر یہ موٹر سائیکل کی فرمائش کیوں؟''

''نہیں پاپا، میرے کئی ساتھی بڑی شان سے موٹر سائیکل پر کالج آتے ہیں۔ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی اسی شان سے کالج جانا چاہتا ہوں۔'' اسد نے کہا۔

''موٹر سائیکل غیر محفوظ سواری ہے بیٹے اور میں تمہیں کوئی خطرہ مول نہیں لینے دوں گا۔'' سیٹھ سلطان نے کہا۔

''پاپا میں تو موٹر سائیکل چلانے کا لائسنس بھی حاصل کر چکا ہوں۔''

سیٹھ صاحب کے دو ہی بیٹے تھے۔ ایک فہد جو امریکہ ایم۔ ایس کی ڈگری کے حصول کے لئے گیا ہوا تھا اور دوسرا اسد جو اچھے نمبر سے میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوا تھا۔ اسد کو ماں اور باپ دونوں بے حد پیار کرتے تھے۔ اس کی ہر خواہش پوری کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتے تھے لیکن موٹر سائیکل دلوا کر خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔

تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن ناشتے کی میز پر اسد وہی سوال کرتا اور سیٹھ سلطان وہی جواب دیتے جو پہلے دے چکے تھے۔ اب اس سوال جواب میں بیگم سلطان بھی شامل ہونے لگیں اور بیٹے کی حمایت میں سیٹھ صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن سیٹھ سلطان کسی

صورت رضا مند ہونے کو تیار نہیں تھے۔

موٹر سائیکل کا بھوت اسد پر اس طرح سوار ہوا کہ وہ ذہنی طور پر بیمار سا ہو گیا۔ وہ ہر دم سوچتا رہتا اور کھویا کھویا رہتا کہ تکمیلِ آرزو کے لئے کیا کیا جائے۔ کبھی ماں کے زیورات لے جا کر فروخت کرنا چاہتا تھا، کبھی والد کی جیب سے روپے نکال لینے کی بابت سوچتا۔ لیکن اس کے اس عمل سے اتنے روپے حاصل نہیں ہو سکتے تھے کہ موٹر سائیکل خرید سکے۔ کبھی خیال آتا کہ قاسم بابا سے روپے مانگ لئے جائیں جو اس گھر کے کیئر ٹیکر تھے لیکن وہ بھی سیٹھ کے علم میں لائے بغیر اس طرح روپے نہیں دے سکتے تھے۔ اس پر موٹر سائیکل کے حصول کے لئے ایک جنون سا سوار تھا اور اس پاگل پن میں وہ سب کچھ جائز سمجھتا تھا۔

اس سلسلے میں اسد نے ایک دن اپنے دوست سہیل سے مشورہ کیا۔ سہیل کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا۔

''بھائی موٹر سائیکل کم از کم اسی نوے ہزار میں آئے گی اور یہ رقم تمہارے پاس نہیں ہے۔ دوسری صورت میں ایک ترکیب یہ ہے کہ کسی کی موٹر سائیکل اٹھا لیتے ہیں۔''

''یار کیا میں چوری کروں گا؟'' اسد بگڑ اٹھا۔

''ماں کا زیور بیچنا اور باپ کی جیب سے روپے نکالنا کیا کارِ خیر ہے؟ وہ بھی تو چوری ہی ہے۔''

اسد نے سر جھکا لیا۔ پھر بولا۔ ''یار اگر پکڑے گئے تو؟''

''ارے کون پکڑتا ہے۔ روزانہ موٹر سائیکل چوری ہوتی ہے لیکن کوئی پکڑا نہیں جاتا۔''

سہیل طریقۂ واردات کی تفصیل بتانے لگا اور اسد غور سے سننے لگا۔

مختلف قسم کی موٹر سائیکل کی چابیاں حاصل کی گئیں۔ دونوں مختلف ہوٹلوں اور دفاتر کے سامنے کھڑی موٹر سائیکلوں کے درمیان سہیل کی موٹر سائیکل کھڑی کر دیتے اور وہاں کھڑی موٹر سائیکلوں پر اپنی چابیاں آزماتے۔ ایک ہفتے کی کوشش میں انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ دونوں فرصت کے اوقات میں مختلف علاقوں میں گھومتے رہتے۔ ایک دن بوندا باندی ہو رہی تھی اور دونوں ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک صاحب اپنی موٹر سائیکل کو اسٹارٹ چھوڑ کر ایک مکان

کے اندر کسی ضرورت سے چلے گئے۔ سہیل نے اشارہ کیا۔

''شہزادے! موقع غنیمت ہے۔ اسے لے کر چلتے بنو، میں تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔''

اسد بغیر کسی تاخیر کے موٹر سائیکل پر سوار ہوا اور یہ جا وہ جا۔

سہیل جب اپنے گھر پہنچا تو اسد کو اپنا منتظر پایا۔ اسد بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''شہزادے، تکمیلِ آرزو کے لئے بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔ یہ تو ابتدائے عشق ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔''

سہیل اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ اس موٹر سائیکل کو بھی اپنے گیراج میں لے گیا اور اپنی موٹر سائیکل کا نمبر پلیٹ کھول کر اسد کی چوری کی ہوئی موٹر سائیکل پر لگا دیا اور چوری کی ہوئی موٹر سائیکل کا نمبر پلیٹ نکال کر الگ رکھ دیا۔

''تم اپنی موٹر سائیکل کا کیا کرو گے؟'' اسد نے پوچھا۔

''میں نیا نمبر لکھوا کر اپنی موٹر سائیکل پر لگوا دوں گا۔''

''یار تمہاری یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی۔''

''تم دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔''

سہیل نے نیا نمبر لکھوا کر اپنی موٹر سائیکل پر لگا دیا اور اپنی موٹر سائیکل کے کاغذات ایک ٹریفک پولیس آفیسر سے تصدیق کر کے اسد کو دے دیا۔

''میری موٹر سائیکل کا نمبر مٹا مٹا سا تھا جو دور سے پڑھا نہیں جاتا اور اگر پولیس نے چیک بھی کیا تو تم تصدیق شدہ کاغذات دکھا دینا۔ اس طرح کسی قسم کے خطرے کا امکان نہیں ہے۔''

چوری شدہ موٹر سائیکل کی شکل وصورت میں بھی کچھ تبدیلی کر دی گئی تا کہ ایک نظر میں پہچانی نہ جا سکے۔ اسد اپنے دوست کی اس دور اندیشی پر ممنون ہوا اور بغیر کسی جھجک اور خوف کے موٹر سائیکل استعمال کرنے لگا۔

سیٹھ سلطان کو جب خبر ہوئی کہ اسد اب موٹر کار سے کالج نہیں جاتا بلکہ موٹر سائیکل پر

جایا کرتا ہے تو انہیں سخت تشویش ہوئی۔ حسب دستور ناشتے کی میز پر جب ملاقات ہوئی تو سیٹھ صاحب نے اسد سے استفسار کیا۔

''پاپا یہ موٹر سائیکل میرے دوست سہیل کے بڑے بھائی عدیل کی ہے۔ عدیل بھائی کناڈا گئے ہوئے ہیں اور ان کی یہ موٹر سائیکل بیکار پڑی ہوئی تھی۔ سہیل نے مجھے استعمال کے لئے دیا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے اور تم نے اپنی ضد پوری ہی کر لی ہے تو سہیل کو اس کی قیمت ادا کر دو یا اسے واپس کر دو۔ میں تمہیں نئی موٹر سائیکل خرید دوں گا۔''

''نہیں پاپا سہیل اسے فروخت نہیں کرے گا۔ ہوسکتا ہے عدیل بھائی واپس آ جائیں۔ پھر اب میں نئی موٹر سائیکل لوں گا بھی نہیں۔ آپ نے میری خواہش کا کوئی خیال نہیں کیا، میں ان دنوں بڑی ذہنی اذیت سے گزرا ہوں۔''

سیٹھ سلطان بیٹے کی جذباتی باتوں سے کچھ شرمندہ سے ہوئے اور دھیمے لہجے میں کہا۔

''اسد تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں نے جو کچھ کیا تمہاری محبت میں کیا اور تمہاری بھلائی کے لئے کیا۔''

اس واقعہ کے تقریباً چار ماہ بعد سیٹھ سلطان کے گھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بیگم سلطان نے ٹیلی فون اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اسد ایک حادثے کا شکار ہو گیا ہے اور اسپتال میں ہے۔ بیگم نے فوراً سلطان صاحب کو اطلاع دی اور اسپتال روانہ ہو گئیں۔ سیٹھ سلطان نے بیگم کو دیکھتے ہی کہا۔

''جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ میں اسی لئے اس سواری کے خلاف تھا۔''

شعبۂ حادثات سے پتہ لگا کر وہ اسد کے کمرے میں پہنچے۔ اسد اب ہوش میں تھا۔ والدین کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔

''پاپا پریشان نہ ہوں، میں ٹھیک ہوں۔ موٹر سائیکل بھی محفوظ ہے۔ مجھے ایک ویگن نے ٹکر مار کر دور پھینک دیا تھا۔ لوگ مجھے اٹھا کر یہاں لائے ہے۔''

ڈاکٹروں سے ملنے کے بعد سیٹھ سلطان کو پتہ چلا کہ بہ ظاہر کوئی چوٹ نہیں ہے لیکن جھٹکے سے ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی ہے اور حرام مغز پر ضرب لگنے کی وجہ سے اسد کے دونوں

پاؤں مفلوج ہوگئے ہیں۔ یہ سنتے ہی سیٹھ سلطان کے اوسان خطا ہوگئے۔ گھبرا کر پوچھا۔

''اگر اس کا علاج یہاں ممکن نہیں ہے تو اسے امریکہ یا لندن لے جاؤں؟''

''جو کچھ یہاں ہوسکتا ہے وہی بیرونی ممالک میں بھی ہوگا۔ یہ کوئی مہلک بیماری نہیں۔ اگر اچھا ہونا ہوگا تو یہاں بھی ہوسکتا ہے ورنہ کہیں نہیں۔''

ڈاکٹروں سے گفتگو کے بعد سیٹھ سلطان بڑی تشویش میں مبتلا ہوگئے۔

''ایم۔آر۔آئی'' اور ''سی۔ٹی۔اسکین'' کے بعد شہر کے مشہور نیوروسرجن اور اسپیشلسٹ کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا اور سبھوں کا متفقہ فیصلہ ہوا کہ چونکہ حرام مغز کا بیشتر حصہ مجروح ہوگیا ہے اس لئے صحت یابی کے امکان مفقود ہیں۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ سن کر سیٹھ بہت مایوس ہوئے لیکن وہ فیصلہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے ساری رپورٹیں امریکہ اور انگلینڈ کے اسپیشلسٹ کو بھیج کر مشورہ طلب کیا۔ ہر جگہ سے وہی جواب آیا جو یہاں کے ڈاکٹروں کی رائے تھی۔

اب سیٹھ صاحب اور ان کی بیگم کے پاس اس مایوسی کے عالم میں سوائے دربارِ خداوندی میں دعا کے اور کچھ نہ رہا۔ سب کام چھوڑ کر دونوں اسد کے کمرے میں رہنے لگے۔ بیٹے کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ دو ہفتے گزر گئے۔ دونوں امید کا چراغ جلائے وقت کاٹتے رہے۔

سیٹھ سلطان بیٹے کے پاس بیٹھے تھے کہ اسد نے بڑی رازداری سے باپ کو اپنے پاس بلایا اور گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''پاپا میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ معاف کردیں گے؟''

سیٹھ سلطان آبدیدہ ہوگئے۔ ''معافی کی کیا بات ہے بیٹے۔ تمہاری ہر بات مجھے منظور ہے۔''

اسد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''پاپا جو موٹر سائیکل میرے استعمال میں تھی وہ دراصل چوری کی تھی۔''

سیٹھ صاحب چونک کر کہنے لگے۔ ''بیٹے تم یہ کیا کہہ رہے ہو!''

''پاپا میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ جب آپ نے موٹر سائیکل نہیں دلوائی تو میں مایوسی کے عالم میں بہت کچھ کر گزرنے کی سوچتا رہا۔ آخر میں کسی کی موٹر سائیکل

اٹھالایا۔''

اس نے باپ کو ساری کہانی سنادی، پھر بولا۔''پاپا آپ مجھے معاف کردیں۔''

سیٹھ صاحب نے آبدیدہ ہوکر اسد کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

''پاپا آپ مجھے مطمئن دیکھنا چاہتے ہیں تو میری ایک آخری التجا قبول فرمایئے۔''اسد نے ہی سکوت توڑا۔

''بیٹا جلدی بتاؤ۔''سیٹھ سلطان نے بے قراری سے کہا۔

''وہ موٹر سائیکل جس کی ہے اسے واپس کردیں اور ساتھ ہی کفارہ بھی ادا کردیں موٹر سائیکل کے معاوضے کے طور پر۔''

''واپس تو کردوں لیکن اس کا اتا پتا تو معلوم ہو۔''

''پاپا میرے اسٹڈی روم میں میز کی دراز میں نمبر پلیٹ ہے اور کچھ کاغذات ہیں۔ اس میں نام اور ٹھکانہ مل جائے گا۔''

سیٹھ سلطان گھر پہنچے اور کاغذات سے حاصل کئے گئے نام و پتہ پر تلاش کے لئے نکل گئے لیکن نعیم الدین کا سراغ نہ مل سکا۔ سیٹھ صاحب مایوس لوٹ آئے اور اسد کو پوری روداد سنادی۔ اسد کچھ دیر خاموش رہ کر چونکا۔

''پاپا ایک آئیڈیا ہے۔ آپ اخبار میں اشتہار دے دیں۔ ایک موٹر سائیکل جس کا نمبر یہ ہے، چھ ماہ قبل گم ہوگئی تھی۔ اس کے مالک کا نام نعیم الدین ہے، وہ ثبوت فراہم کرکے اپنی موٹر سائیکل لے جائیں۔''

سیٹھ سلطان بیٹے کی ہر بات مان لینے کو تیار تھے۔ انہوں نے اپنے سکریٹری سے رابطہ کیا اور اشتہار دینے کا حکم صادر کردیا۔ دوسرے روز ان کے سکریٹری دو نمایاں اخبار لے کر آئے اور سیٹھ صاحب کو اشتہار دکھایا۔ سیٹھ سلطان نے پڑھ کر اسد کی طرف بڑھا دیا۔ اسد نے پڑھ کر سکون کی سانس لی۔ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ کھلا ہوا منہ کھلا ہی رہ گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا، تم کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟''سیٹھ نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

کوئی جواب نہیں۔ اسد سکون کی لمبی نیند سو چکا تھا۔

اسد کو رخصت ہوئے آج چوتھا دن تھا۔ سیٹھ سلطان کے گھر پر قرآن خوانی میں عزیز و اقارب جمع تھے۔ ان کے ملازم نے آہستہ سے ان کے کان میں کچھ کہا۔ سیٹھ سلطان اٹھ کر اس کے ساتھ باہر چل دیئے۔ باہر دو پولیس کے آدمی اور ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص ان کا منتظر تھا۔

''اخبار میں موٹر سائیکل کے متعلق اشتہار آپ نے دیا ہے؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' سیٹھ سلطان نے جواب دیا۔

''موٹر سائیکل آپ کی تحویل میں ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''جی ہاں گیرج میں رکھی ہے۔ آیئے دکھلاتا ہوں۔''

وہاں پہنچ کر پولیس افسر نے کہا۔ ''نعیم صاحب دیکھیں، یہ موٹر سائیکل آپ کی ہے اور اگر ہے تو کیا ثبوت ہے؟'' سیٹھ صاحب نے اسد کے کمرے سے نمبر پلیٹ اور کاغذات بھی منگوا لئے۔

''موٹر سائیکل کی سیٹ کے نیچے میں نے اپنا نام لکھا تھا۔'' وہ جھک کر سیٹ کے نیچے اپنا نام تلاش کرنے لگا۔ نام درج تھا۔

''آپ اپنی موٹر سائیکل لے جائیں۔ تاوان میں جو رقم آپ کہیں گے وہ بھی میں ادا کر دوں گا۔''

''اس کی گمشدگی کا پرچہ کٹا ہوا ہے۔ بغیر پولیس کی اجازت کے میں یہ نہیں لے جا سکتا۔''

''جو بھی ضروری کارروائی ہے وہ مکمل کر لیں۔ جہاں میری مدد کی ضرورت ہوگی میں حاضر ہوں۔''

''جناب یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''اس موٹر سائیکل کے ساتھ آپ کو بھی تھانے جانا ہوگا اور اپنا بیان لکھوانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے میں چلنے کو تیار ہوں لیکن ابھی تو میرے بیٹے کی موت کے سلسلے میں قرآن خوانی ہے، لوگ آئے ہوئے ہیں، میں اس وقت کیسے جا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ دعا سے فارغ ہو لیں، ہم باہر آپ کا انتظار کرتے ہیں۔''

دعا سے فارغ ہو کر سیٹھ سلطان نے بیگم کو ایک ضروری کام سے تھانے جانے کی اطلاع دے کر پولیس موبائل میں بیٹھ کر تھانے چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تھانہ انچارج

بھی موجود نہیں ہیں، ان کی موجودگی میں ان کا بیان قلم بند ہوگا۔ سیٹھ صاحب کو اندازہ ہوا کہ معاملہ کچھ گمبھیر ہے۔ انہوں نے اپنے وکیل سے رابطہ کیا اور انہیں تھانے پہنچنے کی ہدایت کی۔ تھانیدار بھی آچکا تھا۔ وکیل نے اس سے بات کی۔

''سیٹھ صاحب ایک معزز شہری ہیں، ہماری نظر میں ان کا احترام ہے۔'' تھانیدار نے کہا۔ ''لیکن چوری کی موٹر سائیکل ان کے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔ ان کی ضمانت سٹی مجسٹریٹ کے یہاں سے ممکن ہو سکے گی۔ کل دس بجے ان کے ریمانڈ کے لئے مجسٹریٹ کے پاس ہم لوگ جائیں گے۔ آپ بھی ضمانت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''

دوسرے دن سیٹھ صاحب کو مجسٹریٹ کے پاس حاضر کیا گیا اور ریمانڈ کی درخواست کی گئی۔ ساتھ ہی وکیل صاحب نے ضمانت کی درخواست پیش کر دی۔ مجسٹریٹ نے پولیس کی باتیں اور وکیل کے دلائل سن لینے کے بعد فیصلہ دیا کہ چونکہ پولیس نے ابھی تک چالان داخل نہیں کیا ہے اس لئے ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ ساتھ ہی پولیس افسر کو حکم دیا کہ دو دن کے اندر حتمی چالان مع ایف۔ آئی آر کے کورٹ میں پیش کیا جائے۔ پولیس کو دو دن کا ریمانڈ مل گیا۔ دو دن بعد مقدمہ پیش ہوا اور بحث مباحثہ کے بعد سٹی مجسٹریٹ نے اسی دن فیصلہ دے دیا۔ مجسٹریٹ نے یہ مانتے ہوائے فیصلہ دیا کہ گو کہ جرم کرنے والا اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن سیٹھ سلطان کی غفلت اور بچے کو درست تربیت نہ دینے کے باعث جرم کا ارتکاب ہوا لہٰذا عدلیہ سیٹھ سلطان کو دو ماہ قید کی سزا سناتی ہے اور پچاس ہزار روپیہ جرمانہ بھی ادا کرنی ہوگی۔ پچیس ہزار مسمی نعیم الدین کو بطور تاوان ادا کیا جائے اور پچیس ہزار سرکاری خزانے میں جمع کر دیا جائے۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں دو ماہ مزید قید کی سزا کاٹنی ہوگی۔ دو ہفتہ کے اندر ہائیکورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کی جاسکتی ہے۔ سیٹھ سلطان کے وکیل نے کہا کہ یہ فیصلہ غیر قانونی اور غیر منطقی ہے۔ جج کے کورٹ میں اپیل کروں گا۔

''آپ اپیل نہ کریں۔'' سیٹھ سلطان نے کہا۔ ''اپیل تیار کرنے، داخل کرنے، تاریخ لینے اور مقدمہ کے چلنے میں یوں بھی دو ماہ گزر جائیں گے۔ آپ اپیل نہ کریں، میں یہ سزا ''کفارہ'' سمجھ کر بھگت لوں گا۔''

☆☆☆

خودرَو

سیّد امداد علی شہر کے مشہور وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ معاشرے میں ان کی نمایاں حیثیت تھی۔ ہندو مسلمان سبھی ان کے موکلوں میں تھے۔ وہ ایک باوقار زندگی گزار رہے تھے کہ یکا یک حالات تبدیل ہوگئے۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ لوگوں کے رویوں میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ تعصب اور فرقہ پرستی جنم لینے لگی۔ امداد علی کی وکالت پر بھی خاصا اثر پڑا۔

سید امداد علی نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے سارے وسائل کو سمیٹ کر اپنی بیگم اور نوزائیدہ بیٹا سجاد علی کو ساتھ لے کر کراچی آگئے۔ اپنے ماموں بشارت حسین کے یہاں قیام کیا۔ بشارت حسین اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔

امداد علی نے آتے ہی اپنے ماموں کی معاونت سے بنک اکاؤنٹ کھولا، رہائش کے لئے ایک مکان خریدا، چیمبر کے لئے بھی معقول جگہ کا انتظام کیا، کار خریدی اور ہائیکورٹ میں رجسٹریشن کروا کر وکالت شروع کر دی۔ ابتدا میں تو پس ماندہ رقوم سے گزارہ کرتے رہے لیکن سال لگتے لگتے ان کی وکالت چمک اٹھی اور جلد ہی شہر کے بڑے وکیلوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

وقت گزرتا گیا اور سجاد علی نے بھی تعلیمی منازل طے کرتے ہوئے وکالت کی ڈگری حاصل کرلی۔ امداد علی کی خواہش تھی کہ بیٹا لندن جا کر بیرسٹری کی سند لے کر آئے۔ چنانچہ انہوں نے سجاد علی کو لندن بھیج دیا۔ سجاد علی لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر آگئے۔ امداد علی نے بیٹے کے لئے ایک چیمبر کا بندوبست کیا اور بڑی دھوم دھام سے اس کی افتتاحی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس

طرح سجاد علی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بہت ہی کم عرصے میں ان کی بیرسٹری چل پڑی۔

اب امداد علی اور ان کی بیگم کو سجاد علی کی شادی کی فکر ہوئی۔ ایک سے ایک رشتے آئے۔ بڑے بڑے وڈیروں جاگیرداروں نے بھی انہیں اپنا داماد بنانا چاہا لیکن سجاد علی کسی طرح شادی کے لئے رضامند نہیں ہوئے۔ والدین کو گھر میں رونق کی فکر تھی۔ شادی ہو، اور پوتے پوتیوں سے گھر میں چہل پہل ہو۔ ایک دن ماں نے بیٹے کو شادی پر آمادہ کرنے کے لئے بہت اصرار کیا اور کچھ ایسی باتیں کہیں کہ سجاد علی مجبور ہو گئے لیکن شادی پر اس شرط پر آمادہ ہوئے کہ لڑکی کسی غریب اور شریف گھرانے کی ہو۔ والدین اس پر راضی ہوئے لیکن رشتہ کی تلاش میں دشواری یہ تھی کہ سجاد علی کی والدہ کے تعلقات صرف اپنی سطح کے گھرانوں سے تھے۔ اس لئے غور و فکر کے بعد طے ہوا کہ میر صاحب کے ذریعہ سلسلۂ جنبانی کی جائے جو ان ہی کے علاقے کے رہنے والے تھے اور اکثر آتے رہتے تھے۔ وکیل صاحب نے میر صاحب سے گزارش کی تو میر صاحب فوراً آمادہ ہو گئے اور دوسرے ہی دن اپنی بیگم کو لے آئے۔ دونوں بیگمات مل کر مختلف گھروں میں ملاقات کے بہانے جاتیں اور لڑکی دیکھ آتیں۔ کئی ہفتے گزر جانے کے بعد بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک دن بیگم امداد علی کو خیال آیا کہ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنا بے سود ہے۔ میر صاحب کی بھی ایک لڑکی تھی جو سجاد علی کی طرح ہی اکلوتی بھی تھی۔ قبول صورت بھی تھی اور شائستہ بھی۔ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ میر صاحب ہی سے لڑکی مانگ لی جائے۔ بیگم نے وکیل صاحب کو کہا کہ میر صاحب سے بات کریں۔ وکیل صاحب نے میر صاحب کو اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ میر صاحب کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ بڑی دیر تک وہ حیرت میں مبتلا رہے۔ پھر اپنی بیگم سے مشورے تک کی مہلت مانگی۔

کئی دن بعد میر صاحب آئے اور اپنی رضامندی کا اظہار کیا لیکن دبی زبان میں اپنی کم مائیگی کا بھی اشارہ دے دیا۔ وکیل صاحب نے انہیں تسلی دی اور سجاد علی کی شرائط بھی بتا دیں تاکہ میر صاحب مطمئن ہو جائیں۔

وکیل صاحب نے ایک کوٹھی کرائے پر لی اور اسے ملازمین و موٹر کار سے آراستہ کر کے میر صاحب کو اس کوٹھی میں منتقل ہونے کو کہا۔ وکیل صاحب کے اصرار پر میر صاحب کو وہاں رہائش

اختیار کرنی پڑی۔

شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ میر صاحب کو ایک با حیثیت رئیس کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر صاحب واپس اپنی رہائش گاہ پر چلے گئے۔

سجاد علی اپنی بیگم کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اکثر کچھ نہ کچھ تحفہ دیا کرتے۔ بیگم کی تمام خواہشات کا احترام کرتے لیکن ان کے درمیان کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو دونوں کو بے چین کئے رکھتی۔ جب دو سال گزر گئے تو سجاد علی کے والدین کو پوتا پوتی کی فکر بے چین کرنے لگی۔

شہر میں طوفان اور بارش کا سلسلہ شروع ہوا اور باد و باراں کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ بوسیدہ مکانات زمیں بوس ہو گئے۔ بیگم سجاد علی کو اپنے والدین کی فکر ہوئی جو ایک بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے اپنی پریشانی کا اظہار سجاد علی سے کیا تو وہ بارش تھمنے کے بعد میر صاحب کے محلے پہنچے۔ وہاں قیامت کا منظر تھا۔ کئی مکانات زمیں بوس ہو چکے تھے۔ میر صاحب کا مکان بھی اس تباہی کی زد میں تھا۔ میر صاحب اپنی بیگم سمیت اس تباہی کی نذر ہو چکے تھے۔

اسی دوران بیگم سجاد علی نے اپنے شوہر کی توجہ اپنے ایک رشتہ دار شرف الدین کی طرف دلائی جو ڈرائیور تھا لیکن ان دنوں بے روزگار تھا۔ سجاد علی نے نہ صرف اسے ملازم رکھ لیا بلکہ ایک گاڑی بھی خرید لی تاکہ بیگم اپنی مرضی سے جب جہاں چاہیں آ جا سکیں۔

قت کی سوئی آگے بڑھتی رہی۔ سجاد علی کے والد کچھ دنوں بیمار رہنے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ سجاد علی کی والدہ شوہر کے انتقال کے بعد کافی چڑچڑی ہو گئی تھیں اور بات بات پر بہو پر برس پڑتیں۔ بیگم سجاد علی اپنی ساس کے سخت رویوں کے سبب اداس اور رنجیدہ رہنے لگیں۔

بیگم سجاد علی تقریباً روزانہ شرفو کے ساتھ گھومنے چلی جاتیں۔ سجاد علی کی والدہ کو یہ بات قطعی پسند نہ تھی۔ ایک دن غصہ میں انہوں نے بہو کو بہت سخت سست کہا اور بیٹے کی دوسری شادی کی دھمکی دی، اور انہیں بانجھ ہونے کا طعنہ دیا۔ بیگم سجاد علی بے حد پریشان رہنے لگیں۔ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر خود کو آمادہ کرنے لگیں لیکن اچانک سجاد علی کی والدہ کو دل کا دورہ پڑا اور وہ کوئی طبی امداد ملنے سے پیشتر ہی چل بسیں۔

بیگم امداد علی کی موت کے بعد بیگم سجاد علی نے کچھ راحت محسوس کی لیکن کسی انجانے خوف سے کبھی کبھی زرد پڑ جاتیں۔ ایک دن بیگم سجاد علی اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم میں آ رہی تھیں کہ چکرا کر صوفے پر گر پڑیں۔ سجاد صاحب کو ٹیلی فون کیا گیا مگر وہ نہ ملے۔ شرفو نے گاڑی نکالی اور انہیں لے کر ان کی فیملی ڈاکٹر ثریا کے کلینک پر لے گیا۔ ڈاکٹر ثریا نے انہیں فوری طبی امداد دے کر گھر بھیج دیا اور ایک ہفتہ بعد پھر بلایا۔ سجاد علی کو خبر ملی تو وہ کلینک پر پہنچ گئے لیکن بیگم وہاں سے گھر جا چکی تھیں۔ سجاد صاحب نے ڈاکٹر ثریا سے بیماری کی نوعیت پوچھی تو وہ مسکرا کر بولیں۔

''گھبرائیں نہیں۔ خوشی کی بات ہے، آپ کی بیگم ماں بننے والی ہیں۔''

یہ سنتے ہی سجاد علی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ الٹے پیروں گھر لوٹ آئے۔ بیگم سے استفسار کیا تو بیگم نے کہا کہ یوں ہی سر چکرا گیا تھا۔

سجاد علی نے کہا۔ ''ڈاکٹر تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔''

''وہ کیا کہہ رہی تھی؟'' بیگم نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہی تھی کہ تم ماں بننے والی ہو۔''

بیگم سجاد علی کا چہرہ کچھ دیر کے لئے فق ہو گیا لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے آپ کی والدہ کی دعا قبول ہو گئی ہو۔''

سجاد علی نے بڑی ترشی سے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہیں بغیر بیج کے پودا اگتا ہے۔''

بیگم سجاد علی میں نہ جانے کہاں کی ہمت آ گئی تھی، بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''پودے خودرَو بھی تو ہوتے ہیں۔''

☆☆☆

فتویٰ

اگست کا مہینہ تھا۔ رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ شام کے پانچ بجے ہوں گے۔ موسم کی مناسبت سے میں بھٹے بھنوا کر کھا رہا تھا۔ یکا یک ہمسائے کے مکان سے کسی کے زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے اپنے بھانجے گڈو کو آواز دے کر کہا کہ ذرا دیکھو تو خالہ کے یہاں کیا ہو رہا ہے، کون اتنی اونچی آواز میں بول رہا ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے ہم لوگ فردوس کی امی کو خالہ اور اس کے ابو کو خالو کہتے تھے۔ گڈو نے تھوڑی دیر بعد آ کر بتایا کہ فردوس آپا کے دولہا زور زور سے بول رہے ہیں اور نانی ہاتھ جوڑے کچھ کہہ رہی ہیں۔ معاملہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ ابھی چند ہی ماہ تو شادی کو ہوئے ہیں، بھلا ایسی کون سی بات پیدا ہوگئی۔

چند ساعت بعد خالہ کے گھر سے رونے کی آواز آنے لگی اور کسی مرد کی آواز میں تندی اور تلخی نمایاں سنائی دینے لگی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں فوراً اٹھا اور دروازے پر دستک دے کر آواز دی۔

''خالہ کیا بات ہے، دروازہ کھولیں۔''

خالہ نے فوراً دروازہ کھول دیا اور میں اندر گیا تو عجیب منظر تھا۔ فردوس کو بازو سے پکڑ کر اس کا شوہر کہہ رہا تھا تمہیں ابھی میرے ساتھ جانا ہوگا۔ فردوس جانے سے انکار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی میرے ابو کو آنے دیں لیکن فردوس کے شوہر اپنی بات پر اڑے رہے۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان آپ شریف آدمی ہیں اور یہ گھر اور محلّہ بھی شریفوں کا ہے۔ آپ ایسی بداخلاقی پر کیوں اتر آئے ہیں۔ آپ معاملہ کو خوش اسلوبی سے سلجھانے کی کوشش کریں۔''

ظفر صاحب فردوس کا ہاتھ چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''میاں تم کون ہو ہم لوگوں کے درمیان دخل دینے والے؟''

میں نے کہا۔ ''خالو گھر پر نہیں ہیں اس لئے پڑوسی کے ناتے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں ان لوگوں کی مدد کروں۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خالو آ گئے اور خوفزدہ ماحول کو دیکھ کر استفسار کیا۔ خالہ نے روتے ہوئے پوری روداد سنادی۔

خالو نے کہا۔ ' ظفر بیٹے تمہارے بزرگوں سے یہ بات طے ہوگئی تھی کہ فردوس رخصتی کے چند دن بعد میرے یہاں آ جائے گی اور پھر فائنل امتحان کے بعد مستقل آپ کے گھر چلی جائے گی۔ میں شادی پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پڑھائی نامکمل رہ جائے۔ آپ اپنے بڑے بھائی اور چچا سے معلوم کرلیں۔ آپ آتے جاتے رہیں ہم لوگوں کے سر آنکھوں پر۔''

''شادی مجھ سے ہوئی ہے، میرے بزرگوں سے نہیں۔'' ظفر نے جواب دیا۔ ''فردوس میری بیوی ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت ساتھ لے جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کون مجھے روکتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ فردوس کی طرف لپکے اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ خالو نے روکنے کی کوشش کی تو انہیں ظفر نے دھکا دے دیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے گرجدار آواز میں کہا۔

''آپ فوراً فردوس کا ہاتھ چھوڑ دیں۔ یہ کوئی شرافت نہیں کہ کسی کو گھسیٹ کر اس کی مرضی کے خلاف کوئی لے جائے۔''

ظفر نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا اور تیز قدم چلتے ہوئے برآمدے سے کمرے میں گئے اور ایک ہینڈ بیگ لے کر واپس آئے۔

''میں لے کر ہی جاؤں گا چاہے پولیس کی مدد ہی کیوں نہ لینی پڑے۔''

وہ غصے میں بھرے ہوئے باہر نکل گئے اور تمام لوگوں کو ورطۂ حیرت میں چھوڑ گئے۔

میں اپنے گھر لوٹ آیا اور آئندہ کے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن اس روز بات وہیں رہ گئی اور

سکوت طاری رہا۔

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد شام کے وقت خالہ کے رونے کی آواز آئی۔ میں گھر پر ہی تھا۔ رونے کی آواز سن کر میں نے آپا کو کہا کہ دیکھئے خالہ کے گھر سے رونے کی آواز کیوں آ رہی ہے۔ آپا سارے کام چھوڑ کر فوراً خالہ کے گھر گئیں اور کچھ دیر بعد لوٹیں تو معلوم ہوا کہ فردوس کے شوہر نے طلاق نامہ بھیج دیا ہے۔ خالہ اسی پریشانی میں رو رہی تھیں۔ آپا ان کو سمجھا کر آئی تھیں کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا، اب رونے دھونے سے کیا ہوگا۔

میں نے یہ خبر سن کر برجستہ کہا۔ ''اچھا ہوا، غیر معقول انسان سے چھٹکارا مل گیا۔''

''ایسا نہیں کہتے۔'' آپا نے ٹوکا۔ ''طلاق عورت کے لئے لعنت کا طوق ہے۔ پھول سی فردوس کی قسمت ہی خراب تھی جو ایسے شخص سے بیاہی گئی۔''

کچھ دنوں بعد جب میں خالہ کے گھر گیا اور فردوس کو رسمی جملوں سے تسلی دلانے کی کوشش کی تو اس نے بلا تکلف کہا۔

''خس کم جہاں پاک۔ مجھے ایک غیر مہذب اور نامعقول شخص سے چھٹکارا مل گیا۔''

دراصل فردوس اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن خالو اور خالہ اس رشتہ پر اس لئے آمادہ نہیں تھے کہ وہ شادی غیر برادری میں نہیں کر سکتے تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق وہ اپنے کفو میں ہی شادی کریں گے۔ ان لوگوں کے اس رویہ سے ہم لوگوں کی آرزو خاک میں مل گئی۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے آپا سے کہا۔ ''آپا آپ خالہ اور خالو سے کہہ کر دیکھیں۔ شاید موجودہ حالات میں وہ مان جائیں۔''

'تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جو طلاق شدہ ہے۔ کیا تیرے لئے لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے۔''

''آپا اس میں کیا خرابی ہے۔ میں فردوس کو ابھی بھی چاہتا ہوں۔'' میں نے آپا کی بڑی خوشامدیں کیں، ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے کہا۔

''ابھی تو اس کی عدت بھی پوری نہیں ہوئی۔ ذرا زخم بھر جائے تو دیکھوں گی۔''
اشارے اشارے میں فردوس نے بھی کہا کہ امی سے بات کر کے دیکھو شاید بات بن جائے۔

ابھی عدت پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ بزرگ خالو کے گھر آئے۔ کچھ دیر رہے اور چلے گئے۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ کون لوگ تھے اور کیوں آئے تھے۔ پتہ لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ ظفر کے رشتہ دار تھے اور خالو سے کہنے آئے تھے کہ ظفر نے جذبات میں آ کر یہ غلط حرکت کی ہے، اسے آپ لوگ معاف کر دیں اور طلاق نامہ واپس کر دیں۔ خالو ٹھہرے مذہبی خیال کے آدمی۔ انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ طلاق دے دیا سو ہو گیا۔ آپ لوگ جائیں۔

کچھ دنوں کے بعد پھر چند حضرات آئے اور ایک مفتی کا فتویٰ لے کر آئے کہ اس طلاق نامے کو پہلی طلاق سمجھا جائے اور پہلی طلاق کے بعد میاں بیوی رجوع ہو سکتے ہیں۔ اگر باری باری تین قسطوں میں طلاق دی جائے تو پھر شوہر پر بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ خالو اس فتویٰ کو ماننے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ خالو نے بھی اس واقعہ پر مختلف مکاتب فکر کے علماء سے فتویٰ طلب کیا۔ علماء کی رائے مختلف تھی۔ کسی نے کہا طلاق ہو گئی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کسی نے کہا کہ صرف ایک طلاق ہوئی ہے، دو ابھی باقی ہیں۔ اس درمیان شوہر اپنی منکوحہ سے رجوع ہو سکتا ہے۔ خالو عجب کشمکش میں پڑ گئے کہ کس فتوے کو تسلیم کریں۔

آخر میں دس پندرہ بزرگوں کی پنچایت بلائی گئی اور یہ معاملہ ان کے درمیان رکھا گیا۔ کافی بحث مباحثے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یہ طلاق باطل سمجھا جائے اور فردوس کو اس کے امتحان ختم ہونے پر رخصت کر دیا جائے۔

پنچایت کے فیصلے کے دباؤ میں آ کر فردوس کو اس کی مرضی کے خلاف رخصت کر دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد خالو کا انتقال ہو گیا اور خالہ مکان بیچ کر اپنی بہن کے پاس چلی گئیں اور ہم لوگوں سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

تقریباً پچیس سال بعد میں کراچی سے اسلام آباد نائٹ کوچ سے جا رہا تھا۔ جہاز اڑنے کے کچھ دیر بعد اکثر لوگوں پر غنودگی طاری ہوگئی اور جہاز میں ایک سکوت کا عالم تھا۔ میں ایک میگزین پڑھ رہا تھا کہ عقب کے سیٹ سے کسی نے ہاتھ سے ٹھوکا لگا کر کہا مسٹر کم روشنی میں پڑھنے سے آنکھ خراب ہوتی ہے۔ میں چونک پڑا کہ نسوانی آواز میں اتنی بے تکلفی سے کون بات کر سکتا ہے۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور مڑ کر جہاز کی مدھم روشنی میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ فردوس تھی۔ میں نے پہچانتے ہوئے کہا۔ ''تم!''

اس نے کہا۔ ''ہاں، میں۔'' پھر اس نے کہا۔ ''میں نے تو آپ کو جہاز پر سوار ہوتے ہی پہچان لیا تھا۔ اس وقت تو گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ اسلام آباد پہنچ کر باتیں ہوں گی۔''

میں خاموش ہوگیا۔ ماضی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ میں خیالوں کی دنیا میں سفر کے دوران کھویا رہا۔ سامان لے کر ہم باہر نکلے تو اس نے ایک ریستوراں میں چل کر بیٹھنے کی تجویز پیش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سرکاری کام سے آیا ہوں، مجھے کچھ لوگ لینے آئے ہوں گے اس لئے جلد باہر نکلنا مناسب ہوگا۔ فردوس نے اپنے گھر میں رہنے کی دعوت دی لیکن میری مجبوری تھی، میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

''میں کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا جہاں دفتر والوں نے میرے رہنے کا انتظام کیا ہوگا۔'' میں نے بتایا۔ فردوس نے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا اور کہا جس ہوٹل میں آپ ٹھہریں مجھے مطلع کر دیں، میں حاضر ہو جاؤں گی۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے فردوس کو ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا دیا۔ وہ دوسرے دن صبح ہوٹل آگئی اور بہت ہی جذباتی انداز میں اپنی روداد سنانے لگی۔ مختصراً معلوم ہوا کہ ظفر نے اس کے ساتھ ہمیشہ سخت گیر رویہ رکھا لیکن صبر و تحمل سے ساری سختیاں برداشت کرتی رہی۔ وہ جاتی بھی کہاں، اس کا تو کوئی بھی نہ تھا۔ وہ بالکل بے سہارا تھی۔ اسی ناسازگار ماحول میں اس نے سات آٹھ سال گزار دیئے۔

فردوس نے کہا کہ ایک دن اسے ایسا لگا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ تم حنفی مسلک کی پیرو ہو اس لئے تم طلاق کے بعد ظفر کے ساتھ آلودہ زندگی گزار رہی ہو۔ جتنی جلد ہو سکے اس آدمی سے چھٹکارہ حاصل کرلو۔ اس دن اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ وہ نجات کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ اس نے سوچا کہ جب تک اسے کوئی ملازمت نہیں ملتی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو جاتی وہ نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیکھنا شروع کیا اور درخواستیں بھیجنے لگی۔ والدین کی دلائی ہوئی تعلیم کام آ گئی اور اسے ایک سرکاری اسکول میں ملازمت مل گئی اور تقریباً سترہ سال سے وہ ملازمت کر رہی ہے اور اسے اس ظالم شخص سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو گئی ہے۔

فردوس نے بتایا کہ وہ نہایت مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ بیٹی کی شادی ہو گئی ہے، وہ شارجہ میں ہے، اس کا شوہر ڈاکٹر ہے۔ اس کا بڑا بیٹا انٹر سائنس میں پڑھتا ہے اور چھوٹا بیٹا میٹرک کا امتحان دینے والا ہے۔ اس نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ لیا، ٹیلی فون نمبر لیا اور آئندہ ملاقات کی توقع لئے رخصت ہوئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد پوری کہانی ماضی تا حال دماغ میں گھوم گئی اور میں سوچنے لگا کہ اب فردوس کے تین بچوں کے متعلق علمائے دین اور مفتیوں کا کیا فتویٰ ہے۔

☆☆☆

گھر کا نہ گھاٹ کا

اعجاز احمد اور عبدالصمد دونوں ہندوستان سے ہجرت کر کے ۱۹۵۵ء میں پاکستان آئے۔ ایک کا تعلق دلی سے تھا اور دوسرے کا حیدرآباد سے۔ ایک کو سرکاری نوکری مل گئی اور دوسرے نے ایک نجی تجارتی ادارے میں ملازمت کر لی۔ چند سال بعد عبدالصمد نے ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کر دیا اور لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ ایک شہر میں رہنے کی وجہ سے دونوں کے آپس میں ارتباط قائم ہوئے اور تعلقات اتنے بڑھے کہ لوگ دونوں کو قریبی رشتہ دار سمجھنے لگے۔

اعجاز احمد کو اللہ نے ایک بیٹا سرمد اور ایک بیٹی مریم سے نوازا تھا۔ عبدالصمد کے دو بیٹے فہد اور اسد اور ایک بیٹی سنبل سے گھر کی رونق تھی۔ دونوں دوست کے بچے پڑھائی کی منازل طے کرتے ہوئے اپنے اپنے مقام پر پہنچ گئے۔ اعجاز احمد کا بیٹا سرمد انجینئر ہوا اور بیٹی مریم نے ہوم اکنامکس میں گریجویشن کیا۔ عبدالصمد کا بڑا بیٹا ایم۔ بی۔ اے اور دوسرا بیٹا اسد ڈاکٹر ہوا۔ ان کی بیٹی سنبل نے بی فارمیسی کی ڈگری حاصل کی۔

دونوں گھرانے خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ اب دونوں گھرانوں میں بچوں کی شادی کا سوال تھا۔ عبدالصمد کے بڑے بیٹے فہد کی شادی، اپنی چچازاد بہن سے ہو چکی تھی۔ اب دیگر بچوں کی فکر تھی۔ اعجاز احمد مریم کے لئے اور عبدالصمد اپنی بیٹی سنبل کے لئے فکر مند تھے۔ دونوں لڑکیوں کی شادی میں دقت ہو رہی تھی۔ لوگ لڑکی دیکھنے آتے، ناشتہ چائے سے فارغ ہو کر چلے جاتے اور پھر پلٹ کر نہ آتے نہ جواب دیتے۔ دونوں گھرانوں میں یہی سلسلہ تھا۔ دونوں اسی مسئلے

سے دوچار تھے۔

ایک دن دونوں اسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ یکا یک اعجاز احمد بول اٹھے۔ کیوں نہ ہم لوگ لڑکے اور لڑکی کی شادی ادل بدل کے اصول پر کر لیں۔ عبدالصمد نے سنتے ہی کہا بھائی خیال تو بہت اچھا ہے لیکن اس کے لئے بیگمات اور بچوں کی رائے لینی ضروری ہوگی۔ چنانچہ اس تجویز کے تحت دونوں نے اپنی اپنی بیگمات سے رائے طلب کی۔ دونوں کی بیگمات فوراً رضا مند ہوگئیں اور کہنے لگیں اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں، بچوں میں بھی آپس میں کافی میل جول ہے۔ اب رہا بچوں کی مرضی تو لڑکیاں تو ہمارے معاشرے میں بے منہ کی سمجھی جاتی ہیں، جہاں شادی طے کر دی جائے گی خاموشی سے قبول کر لیں گی۔ رہا لڑکوں کا معاملہ تو ان لوگوں کی رائے معلوم کر لی جائے گی۔ دونوں کی ماؤں نے جب اپنے اپنے بیٹے کو اپنے ارادے بتائے تو اعجاز احمد کے بیٹے سرمد نے بغیر ہچکچاہٹ کے کہہ دیا آپ لوگ جو مناسب سمجھیں مجھے منظور ہے لیکن اسد نے صاف انکار کر دیا کہ وہ ادل بدل کی شادی نہیں کرے گا۔ ماں نے بہت سمجھایا۔ باپ نے بھی اپنے بڑھاپے کا واسطہ دیا، بہن کے لئے کوئی رشتہ نہ ملنے اور ڈھلتی ہوئی عمر کی طرف توجہ دلائی لیکن اسد کسی طرح تیار نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ ادل بدل کی شادی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر ذرا بھی کہیں گڑ بڑ ہوئی تو چار زندگیاں متاثر ہوں گی۔ اس نے مزید کہا کہ وہ شادی لیڈی ڈاکٹر نشاط سے کرنا چاہتا ہے جو اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس نے کہا میں اور نشاط ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ماں اور باپ اسد کی توجیہ سن کر خاموش ہو گئے۔

ایک دن ایک رشتہ سنبل کے لئے آیا۔ لڑکا میٹرک پاس تھا اور شادی سے پہلے اس کے لئے گھر یا فلیٹ کا انتظام بھی ضروری تھا۔ بیگم عبدالصمد کو اس رشتے سے بہت دکھ ہوا کہ پڑھی لکھی لڑکی کا یہ حشر ہو رہا ہے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ اس واقعہ کو برداشت نہ کر سکیں۔ ان کا دل بہت خراب ہوا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ شوہر نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے۔ اسی دوران اسد آ گیا اور ماں سے پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا، آپ اس طرح رو کیوں رہی ہیں؟''

''معلوم نہیں بیٹی کے رشتے کے لئے مجھے کتنا ذلیل ہونا پڑے گا۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

'' آخر ہوا کیا؟'' اسد نے پھر پوچھا۔

''ایک صاحبہ سنبل کا رشتہ ایک جاہل لڑکے کے لئے مانگنے آئی تھیں۔ مزید براں گھر یا فلیٹ کی جہیز میں فرمائش تھی۔ خدا کی پناہ، بیٹی کی ماں کیا کرے۔'' بیگم عبد الصمد نے عجب اضطراری کیفیت میں اسد سے کہا۔'' بیٹا، تو نے میری بات مان لی ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ خاندان کی بھلائی کے لئے اپنے ارمانوں اور محبت کا خون بھی کرنا پڑے تو تجھے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ میں زندگی میں تجھ سے کچھ نہیں چاہوں گی اگر تو نے میری اس مشکل کو حل کر دیا۔ اگر تو نے ہمیں اس بھنور سے نکال دیا تو میں زندگی بھر تیری احسان مند رہوں گی۔''

ماں کی دلدوز تقریر سے اسد کا دل نرم پڑ گیا اور اس نے کہا۔'' آپ لوگ جو چاہیں گے مجھے منظور ہوگا۔ آپ بات پکی کر لیں۔''

ماں نے آنسو پونچھ لئے اور بیٹے کی بلائیں لیں۔

دونوں خاندانوں میں رشتے کی باتیں طے ہو گئیں اور شادی کی رسم انجام پا گئی۔ دونوں گھروں میں تعلقات مزید مستحکم ہو گئے لیکن چند ہی دنوں کے بعد مریم کو یہ اندازہ ہوا کہ اسد کا رویہ مخلصانہ نہیں ہے بلکہ معاندانہ ہے۔ گفتگو میں اس کے خلوص و محبت کی جگہ بے رخی اور روکھا پن ہے۔ اس کے برعکس مریم ہر وقت اپنے شوہر کی خوشنودی میں لگی رہتی۔ آخر ایک دن مریم نے اسد سے پوچھا۔

'' کیا آپ مجھ سے کسی بات پر ناراض ہیں؟''

روایت کے قیدی

نہیں تو۔'' اسد نے جواب دیا۔

'' کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟''

''نہیں۔'' اسد نے کہا۔

'' کیا آپ مجھ میں کوئی کمی محسوس کرتے ہیں؟''

''نہیں۔'' اسد نے کہا۔

''پھر کیا بات ہے؟ روزِ اول سے آپ کشیدہ اور کبیدہ رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ آخر میں آپ کی منکوحہ ہوں، آپ کے التفات کا مجھے حق ہے۔''

''بات صرف اتنی ہے کہ تم میری پسند نہیں ہو۔'' اسد بلا تکلف بول اٹھا۔

''تو پھر آپ نے یہ شادی کیوں کی؟''

''ماں باپ کا بوجھ ہلکا کرنے اور بہن کی زندگی سنوارنے کے لئے۔'' اسد نے بلا تکلف جواب دیا۔

''میں بھی تو کسی ماں باپ کی بیٹی ہوں اور کسی بھائی کی بہن۔ میری زندگی اجیرن کیوں ہو؟''

''میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں وہ توجہ اور التفات نہیں دے سکتا جس کی تم توقع کرتی ہو۔''

وقت گزرتا گیا۔ مریم اسد کی بے رخی برداشت کرتی رہی اور اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر گوارا کرتی رہی۔ اس نے اپنے والدین سے بھی اپنی بے بسی اور محرومی کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح چند مہینے اور گزر گئے لیکن اسد کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسد نشاط کی محبت میں گرفتار تھا لیکن عجیب اتفاق کہ نشاط اپنے والد تسکین مولائی اور اپنی والدہ کے ساتھ کناڈا ہجرت کر گئی تھی۔ اس لئے اس کا رابطہ نشاط سے ٹوٹ گیا تھا۔

ایک عرصہ کے بعد اچانک نشاط کا ایک خط آ گیا جس میں اس نے اسد سے پوچھا تھا کہ وہ کب تک اس کا انتظار کرے۔ اتفاق سے وہ خط مریم کو اسد کی پینٹ استری کرتے ہوئے مل گیا۔ اس نے خط پڑھا اور نشاط کا پتہ نوٹ کر کے خط کو پینٹ میں رکھ دیا۔ دوسرے دن اس نے نشاط کو اسی پتہ پر مطلع کیا کہ اسد کا انتظار بیکار ہے، اسد کی شادی ہو چکی ہے، تم اپنا بندوبست کر لو۔ ادھر اسد نے نشاط کو لکھا تم میرا انتظار کرو، میں ویزا حاصل کر کے جلد پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ نشاط عجب کشمکش میں مبتلا ہو گئی کہ کس خبر کو وہ درست سمجھے۔

اسد نے مریم سے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے دوسرے شہر جا رہا ہے۔ اگر تم چاہو تو کچھ دنوں کے لئے اپنے میکے چلی جاؤ۔ مریم نے غنیمت جانا کہ کچھ دن تو میکے میں گزارے گی۔ اس

کے دماغ کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو گا۔

مریم اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ جانے کے تین دن بعد اسے ایک رجسٹرڈ خط ملا جس میں مریم کے لئے طلاق نامہ تھا۔ خط پڑھتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ سنبل رونا دھونا سن کر فوراً آ گئی اور استفسار کیا تو بیگم اعجاز نے کہا تمہارے بھائی نے ہم لوگوں کو زندہ درگور کر دیا۔ میری معصوم بیٹی مریم کو طلاق دے دی۔ سنبل یہ سن کر چونک گئی اور اپنے بھائی کی اس نازیبا حرکت پر اسے بہت ملال ہوا۔ اس نے فوراً ماں کو ٹیلی فون پر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ ماں سن کر حیران رہ گئیں اور کہا کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ اسد نے یہ ذلیل حرکت کیوں کی، شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

بیگم عبدالصمد فوراً سمدھیانے آئیں اور جتنا ہو سکتا تھا بیٹے کو برا بھلا کہا۔ بیگم اعجاز نے کہا۔

''اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ میری بیٹی کی قسمت تو پھوٹ گئی اعجاز صاحب کی پگڑی تو اچھل گئی۔ ہم لوگ مایوسی اور ذلت کے سمندر میں تو غرق ہو گئے۔''

اسد کی والدہ سنتی رہیں اور دل ہی دل میں بیٹے کی اس حرکت پر پشیمان ہوتی رہیں۔ بیگم عبدالصمد نے جب بیٹے سے باز پرس کی تو اسد نے کہا۔

''آپ کی بات مان کر میں نے آپ کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اب میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے کچھ کروں گا۔''

ماں تو غصہ کر کے خاموش ہو گئیں۔ عبدالصمد صاحب کو جب علم ہوا تو جلال میں آ گئے اور بیٹے کو کہا۔ ''تم فوراً میرے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ ہم لوگوں کی پچاس سال کی رفاقت پر تم نے وہ ضرب لگائی کہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہا۔''

اسد تو فرار چاہتا ہی تھا۔ اپنے والد کی سخت سست باتیں سن کر اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا اور کناڈا جانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ ویزا ملتے ہی وہ فوراً کناڈا روانہ ہو گیا۔

ادھر سرمد کی والدہ پیچھے پڑ گئیں کہ وہ بھی سنبل کو طلاق دے دے۔ سرمد نے ماں سے کہا۔ ''میں کیوں اپنی بیوی کو طلاق دوں، اس کا کیا قصور ہے؟''

"بدلہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے۔" ماں نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر ایک زندگی کسی کی حماقت سے خراب ہوئی ہے تو میں وہی حماقت کر کے اپنی اور سنبل کی زندگی تباہ نہیں کر سکتا۔"

سرمد کی ماں اور بہن دونوں نے مل کر سنبل کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ ہر بات پر برا بھلا کہنا، طرح طرح سے پریشان کرنا، ذہنی اذیت دینا روز کا معمول بن گیا تھا۔

تنگ آ کر سنبل نے اپنے شوہر سے کہا۔" آپ وہی کریں جو آپ کی ماں اور بہن کہتی ہیں اور مجھے میرے ماں باپ کے پاس بھیج دیں یا مجھے اس دوزخ سے نکال کر کہیں اور لے جائیں، مجھ میں اب برداشت کی سکت نہیں ہے۔ اس روزانہ کی چخ چخ سے میں تنگ آ چکی ہوں۔"

سرمد معقول آدمی تھا۔ اس نے بیگم کو تسلی دی اور اس کی دلجوئی کی۔ اس نے بیگم سے تھوڑی سی مہلت مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ جلد اس نرغے سے اسے آزاد کرا لے گا۔

چند دنوں بعد سرمد نے ایک کرائے کا فلیٹ لے لیا۔ اسے آراستہ کیا اور گھر کو خدا حافظ کہا۔ بیگم کو لے کر فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ اس کے گھر سے چلے جانے پر کسی نے اسے نہیں روکا۔ فلیٹ میں آ کر دم لینے کے بعد سنبل نے چین کی سانس لی اور شوہر کی شکر گزار ہوئی۔

اسد کناڈا پہنچ کر نشاط کے گھر پہنچا اور شادی کا عندیہ دیا۔

"کیسی شادی؟ تمہاری شادی تو ہو چکی ہے۔" نشاط نے کہا۔

اسد کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ گھبرا گیا کہ نشاط کو کیسے خبر ہوئی۔ پھر بھی اپنے کو سنبھالتے ہوئے اسد نے کہا۔"شادی ماں باپ کے دباؤ میں آ کر اپنی بہن کی بھلائی کے لئے کی تھی مگر میں نے اس سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اسے طلاق دے کر آیا ہوں۔ اب اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ میری محبت تو تم ہو۔"

نشاط کو بھی اسد سے گہری محبت تھی لیکن جب وہ اسد کا اس کے پس منظر میں جائزہ لیتی تو اس کی محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی۔ بہر حال اسد کو وہ اپنے ماں باپ کے پاس لے گئی اور پوری روداد سنا دی اور یہ بھی کہا کہ اسد مجھ سے شادی کا خواہاں ہے۔ نشاط نے والدین سے رائے طلب کی۔

تسکین مولائی اور ان کی بیگم دونوں نے کہا کہ جب یہ ایک معصوم لڑکی کو طلاق دے چکا ہے تو وہ یہ حرکت دوبارہ کرنے میں کیا قباحت محسوس کرے گا۔

''ہم لوگوں نے دنیا دیکھی ہے۔ ایسے کچے ذہن کے انسان کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ جوڑنا حماقت ہی نہیں بلکہ خودکشی کے مترادف ہے۔'' انہوں نے اسد سے کہا۔'' میاں تم الٹے پاؤں واپس پاکستان چلے جاؤ اور نشاط کا خیال دل سے نکال دو۔ تمہیں اس خواب کی تعبیر نہیں ملے گی۔''

نشاط نے بھی والدین سے اتفاق کرتے ہوئے شادی سے انکار کر دیا اور اسد کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی صورت میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔

اعجاز احمد معقول انسان تھے۔ بہو اور بیٹے کے ساتھ زیادتی کا انہیں بہت صدمہ ہوا۔ بیٹے کا گھر چھوڑ کر چلے جانا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ وہ سرمد کے پاس اس کے گھر گئے اور بولے۔

''تم لوگوں کے گھر چھوڑنے سے گھر بالکل بے رونق ہو گیا ہے۔ اپنے گھر چلو۔''

''ہمیں گھر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا ورنہ آپ لوگوں کو چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' سرمد نے کہا۔

''مجھے اس کا احساس ہے جب ہی تو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

''ابو، ہمیں کچھ دنوں الگ ہی رہنے دیں۔ انشاء اللہ عنقریب ہم لوگ آپ کے قدموں میں ہوں گے۔''

سرمد نے اپنی بہن کے رشتے کے لئے کئی دوستوں کو کہہ رکھا تھا۔ ایک دوست اپنے بھائی کے ساتھ اس رشتے کا خواہش مند تھا لیکن شرط وہی تھی کہ اس کی بیکاری دور ہو جائے، کوئی ملازمت مل جائے جب ہی یہ ممکن ہو سکے گا۔ سرمد کی کوشش سے اس کی نوکری ایک بڑی کمپنی میں ہو گئی اور حسب وعدہ اس کے دوست کے بھائی سے مریم کی شادی ہو گئی اور وہ پرسکون زندگی گزارنے لگی۔ ماں باپ بھی سرمد کی اس کارکردگی سے بہت خوش نظر آنے لگے۔ گھر کی مایوسی مسرت میں بدل گئی۔ مریم کی رخصتی کے بعد اعجاز احمد کا گھر اور بھی سونا ہو گیا اور ان لوگوں کو بیٹے اور بہو کی شدت سے کمی محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ دونوں سرمد کے گھر گئے۔ سرمد کی ماں نے بہو

سے معافی مانگی اور رو رو کر التجا کی۔

''بیٹی اس حادثے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔اسی پاگل پن میں نہ جانے میں نے تمہیں کیا کیا کہہ دیا جس کے لئے میں بہت شرمندہ ہوں۔ساری زیادتیوں کو بھول جاؤ اور اپنے گھر چلو۔''

سنبل نے کہا۔''امی آپ نے جو کچھ کہا اور کیا وہ حالات سے مجبور ہو کر کیا۔آپ کی جگہ جو بھی ہوتا وہ اسی طرح جذبات سے مغلوب ہو کر کرتا۔آپ کی باتوں کو ہم لوگوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔''

سرمد نے ماں سے کہا۔''اگر آپ ہوش وحواس سے کام لیتیں تو یہ نوبت نہ آتی۔''

''بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو۔میں حالات سے پریشان ہو کر دماغی توازن کھو بیٹھی تھی۔ساری پریشانی کا سبب ادلے بدلے کی شادی ہے۔میرے خیال میں اس طرح کی شادی سے گریز کرنا چاہئے۔ ذراسی حماقت سے چار زندگیاں متاثر ہو جاتی ہیں۔''

اسد کناڈا سے مایوس اور بے نیل و مرام واپس آ گیا۔اس کی آرزو اور محبت پامال ہوگئی۔اسے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔وہ ماں باپ بھائی سب کی نظروں سے گر گیا۔سوائے رسوائی کے اسے کچھ نہ ملا۔،وہ اپنی حماقت پر خجل تھا کہ وہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔

☆☆☆

سراب

ڈاکٹر شہاب ہاؤس جاب کر رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن شروع ہوگیا۔عجب افراتفری کا عالم برپا ہوگیا۔آپس میں اعتماد اٹھ گیا۔بنگالی اور غیر بنگالی میں جو رکھ رکھاؤ تھا، جو باہم ہم آہنگی تھی وہ یکلخت ختم ہوگئی۔چونکہ پاکستانی افواج کی زبان اردو تھی، اس لئے ہر اردو بولنے والا بنگالیوں کی نظر میں غدار اور دشمن نظر آنے لگا۔اس بے اعتمادی کے ماحول سے گھبرا کر اکثر خاندان دوسری ہجرت کر کے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آکر، خصوصاً کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔

شہاب بھی اپنے بڑے بھائی اور اپنی والدہ کے ساتھ سقوطِ ڈھاکا سے پہلے ہی کراچی آگیا اور اپنا نامکمل ہاؤس جاب مکمل کیا۔اب شہاب مزید تعلیم کے لئے ملک سے باہر جانا چاہتا تھا۔وہ روس کو امریکہ اور برطانیہ کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ امریکہ اور برطانیہ لوگوں کا استحصال زیادہ کرتے ہیں۔روس اس قسم کی لعنت سے مبرا ہے۔روس جا کر وہ ماہرانہ سند حاصل کرے تو بہتر ہے۔چنانچہ اس نے روس کے سفارت خانے سے رابطہ کیا اور اپنا مدعا بتایا۔سفارت خانہ کے ذمہ دار لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ روس کی کسی یونیورسٹی سے رابطہ کرے اور داخلے کا اجازت نامہ حاصل کرے۔اس کے علاوہ روسی زبان سیکھے جس کا انتظام اسلام آباد میں موجود ہے۔

شہاب نے سفارت خانے کی ہدایت کے مطابق روسی زبان سیکھنا شروع کیا اور داخلے کا اجازت نامہ بھی حاصل کرلیا۔ اس نے روسی سفارت خانے میں ویزا حاصل کرنے کے لئے درخواست دے دی۔ ویزا لگا اور وہ روس روانہ ہوگیا۔ روس پہنچ کر اس نے سرجری میں پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ شہاب کی خواہش تھی کہ وہ پاکستان واپس نہ آئے۔ وہ روس ہی میں ملازمت حاصل کرلے تو بہتر ہوگا۔ اس کی تعلیمی کارکردگی بہت بہتر تھی اور امتیازی نمبر سے اس نے کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لئے اسے وہاں ملازمت مل گئی۔ اس نے بھائی کو مطلع کردیا کہ وہ فی الحال پاکستان واپس نہیں جائے گا اور روس ہی میں ملازمت کرے گا۔

شہاب کو ملازمت مل جانے کے بعد چھ ماہ کی مزید تربیت مختلف علاقائی زبانوں کی دی گئی۔ اس کے بعد اسے چیچن حکومت کے پاس بھیج دیا گیا۔ چیچن سے اسے کوہ قاف کے علاقہ میں ایک مقامی ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ وہاں شہاب کو کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ زبان جانتا تھا۔ رہنے کے لئے دو کمروں پر مشتمل آراستہ رہائش گاہ بھی اسے مل گئی۔ ماحول کو اس نے سازگار پایا۔ ہسپتال کے دوسرے ڈاکٹر اور ملازمین نے اس کا خیر مقدم کیا اور ہر قسم کے تعاون کی پیش کش کی۔ اپنی محنت اور لگن سے شہاب لوگوں میں گھل مل گیا اور جلد ہی مقبول ہوگیا۔

قاف کا علاقہ قدرتی وسائل اور فطرت کی بوقلمونی سے مالا مال نظر آیا۔ صحت مند اور فرحت بخش آب وہوا، تاحدِ نظر سبزہ زار، درختوں کی قطار، باغ، پہاڑ، بل کھاتے ہوئے آبشار، صبح دم مرغانِ سحر کی نغمہ سرائی، پھولوں کی مہکار، خنک برفیلی ہوائیں، چاق و چوبند سرخ و سفید مرد، پریوں جیسی حسین وجمیل دوشیزائیں اور ان کی توبہ شکن ادائیں قاف کو جنت نظیر بنائے رہتیں۔ شہاب بھی اس دلکش سرزمین میں مسحور ہوگیا۔ لیکن اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ پھر بھی ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے۔ وہ دن رات کی محنت کے باعث کچھ ہی دنوں میں اپنی زندگی میں بوجھل پن محسوس کرنے لگا۔ اسے ذہنی آسودگی کے لئے تفریح کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور وہ اس کی تلاش میں رہا۔

شہاب نے وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا کہ قاف میں تھکے ماندے افراد کے لئے کوئی تفریح گاہ ہے جہاں کچھ دیر رہ کر کسلمندی دور کی جا سکے۔ لوگوں نے کئی مقامات کی نشاندہی کی مثلاً لائبریری، پارک، مختلف کھیلوں کا میدان اور سوئمنگ پول وغیرہ۔ شہاب نے پوچھا کہ ان تفریح گاہوں میں ہسپتال سے قریب تر کون سی جگہ ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ پارک بہت نزدیک ہے۔ وہاں صبح و شام لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے، آپ وہاں جایا کریں، آپ کی طبیعت اس خوشگوار ماحول میں بہل جائے گی اور آپ کی 'بوریت' دور ہو جائے گی۔

چنانچہ شہاب روزانہ شام کو پارک جانے لگا اور وہاں کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پارک بہت ہی خوبصورت بنا ہوا تھا۔ مختلف اقسام کے پودے، رنگ برنگ کے پھول، سبز مخملی زمین، جگہ جگہ مصنوعی فوارے۔ وہاں جو بھی جاتا قدرت کی رعنائیوں میں کھو کر دنیا کے غم بھول جاتا، جب تک وہاں رہتا ایک خاص قسم کا سکون محسوس کرتا۔

ایک دن پارک میں ایک بہت ہی خوشنما اور دلکش پھول کو دیکھ کر اس کی جانب بڑھا۔ اسے چھو کر دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک نسوانی آواز آئی۔ ''پھول توڑنا منع ہے۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس دوشیزہ نے مزید کہا۔

''پھولوں کی رعنائیوں سے محظوظ ہوا جاتا ہے اور اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔''

''میں پھول توڑنے کی نیت سے ادھر نہیں بڑھا تھا۔ میں اسے صرف چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔''

''خوبصورتی دیکھنے کی چیز ہے، چھونے کے لئے نہیں۔'' دوشیزہ بولی۔ ''چھونے سے اس کی پاکیزگی مجروح ہوتی ہے مسٹر۔''

شہاب خاموشی سے سنتا رہا اور اس کی گفتگو سے محظوظ ہوتا رہا۔

''تم یہاں اجنبی لگتے ہو۔'' دوشیزہ نے کہا۔ ''کہاں سے آئے ہو، کہاں رہتے ہو اور کیا کرتے ہو۔''

شہاب نے اسے بے تکلف دیکھ کر سارے سوالات کے جواب دیتے ہوئے خود کو متعارف کرایا۔

پھر بولا۔ ''محترمہ، آپ بھی اپنا تعارف کرائیں۔''

''میرا نام نشاطہ ہے اور میں قاف ہی کی رہنے والی ہوں۔ یہاں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں اور یونیورسٹی کے ہاسٹل ہی میں رہتی ہوں۔ میرے والدین کوہ قاف کے دامن میں سکونت پذیر ہیں۔''

''آیئے کہیں بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔'' نشاطہ نے بے تکلفی سے کہا۔

شہاب اور نشاطہ دونوں تھوڑی دور چل کر ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد اٹھے اور قہوہ خانہ گئے۔ قہوہ نوش کیا اور تھوڑی دیر ساتھ رہ کر خدا حافظ کہہ کر دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ دونوں کا یہ معمول بن گیا کہ شام کو پارک میں کچھ دیر ساتھ ٹہلتے، بیٹھ کر باتیں کرتے، قہوہ پیتے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا اور دونوں آپس میں قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔

ایک دن جذبات سے مغلوب ہو کر شہاب نے نشاطہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ نشاطہ فوراً دور ہٹ گئی اور کہا۔

''مسٹر دور دور رہنے میں پاکیزگی برقرار رہتی ہے۔ آپ اس بے داغ رفاقت کو آلودہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

شہاب نے شرمندہ ہو کر معذرت کر لی۔

''معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔'' نشاطہ نے کہا۔ ''آپس میں معذرت خواہانہ رویے سے خلوص کا رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو صرف کسی نازیبا حرکت سے احتراز کرنا چاہئے۔ یہی دانشمندی کا تقاضا ہے۔''

شہاب کچھ دیر خاموش رہا اور پھر حسب معمول قہوہ پی کر رخصت ہو گیا۔

انسانی جبلت میں خواہش کو بہت دخل ہے۔ انسان اگر کسی چیز کی آرزو کرے تو اسے حاصل کرنے کے لئے شعوری اور لاشعوری طور پر حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی بات شہاب کے ساتھ تھی۔ وہ نشاطہ سے حد درجہ محبت کرنے لگا تھا۔ وہ اسے اپنانا چاہتا تھا۔ روزانہ اس کی محبت

میں مغلوب ہو کر مختلف انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا۔ نشاطہ بھی مثبت ردعمل کا اظہار کرتی۔ وہ بھی شہاب کو اپنے خلوص کا احساس دلاتی لیکن اس نے شہاب سے فاصلہ برقرار رکھا۔ دونوں کی دوستی روز بروز ارتقائی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ ایک دن شہاب سے رہا نہ گیا اور اس نے نشاطہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کر کے اسے رفیقۂ حیات بنانا چاہتا ہے۔

''جب تک کسی کی آرزو پوری نہیں ہوتی وہ جذبات سے کھیلتا ہے اور اس کے حصول کے لئے متحرک رہتا ہے۔ اگر اس کی خواہش پوری ہو جائے تو وہ مطمئن ہو کر سرد پڑ جاتا ہے جبکہ انسان کا لہو ایک مجاہد کے لہو کی طرح گرم رہنا چاہئے اور زندگی کے معرکے میں مستعد رہنا چاہئے۔ طلب انسان کو زندہ رکھتی ہے۔'' نشاطہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

شہاب اس کی فلسفیانہ گفتگو کو سن کر خاموش ہو گیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا شہاب کا دل بے قابو ہوتا گیا۔ اس کے دل و دماغ پر نشاطہ اس طرح چھا گئی کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وہ اسے حاصل کرنے کی جستجو میں رہنے لگا۔ یہ اس کے لئے ایک نفسیاتی مسئلہ بن گیا۔ ایک شام شہاب خود پر قابو نہ رکھ سکا اور جذباتی انداز میں نشاطہ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ نشاطہ نے خود کو دور ہٹا لیا اور پھر شہاب کو تنبیہ کی۔

''شاید تم دوست کے مقدس رشتے سے واقف نہیں ہو۔ اگر تم نے خود پر قابو نہ پایا تو سب کچھ کھو دو گے۔''

''میں اب ایک لمحہ بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' شہاب نے کہا۔ ''اگر کہو تو میں تمہارے والدین سے مل کر تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کروں۔''

نشاطہ خاموش رہی۔ کچھ دیر سکوت رہا۔ دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر حسب دستور دونوں نے قہوہ پینے کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ لیکن آج رخصت ہوتے وقت ان میں گرم جوشی کی بجائے سرد مہری نظر آئی۔

معمول کے مطابق دوسرے دن شہاب شام کو پارک پہنچا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن اسے نشاطہ نظر نہیں آئی۔ اس نے سوچا چلو اپنے مخصوص بنچ پر بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں، وہ آنے ہی

والی ہوگی۔ جب وہاں پہنچا تو اس نے بنچ پر ایک کاغذ پتھر سے دبا ہوا دیکھا۔ اس نے اٹھالیا اور اس پر تحریر شدہ عبارت پڑھنے لگا۔ لکھا تھا:

''پیارے شہاب! تمہیں پیاس بجھانے کے لئے آب کی ضرورت ہے۔ مگر تم اب تک سراب کے پیچھے بھاگتے رہے۔ خدا حافظ۔''

نشاط

چھوٹے نواب

نواب مکرم علی کا شمار علاقے کے پرانے رئیسوں میں تھا۔ جاگیرداری کے علاوہ پھیلا ہوا کاروبار نیز ان کی شادی اپنے چچا معظم علی کی اکلوتی بیٹی سے ہونے کے سبب چچا کی بھی جاگیرداری ان ہی کے تصرف میں آجانے کے باعث وہ ایک امیر کبیر شخصیت تصور کئے جاتے۔ بڑی حویلی کے مالک تھے۔ غلام گردش میں پرورش پانے والے درجنوں ملازمین، مولا زادے اور مولا زادیاں ہمہ دم ایک اشارے پر حاضر رہتے۔ نواب صاحب بڑے ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ منشی، منیجر، کام کرنے والے دیگر عملے اور ڈرائیور موٹر بھی میسر تھے۔ صرف کمی تھی تو خاندانی افراد کی۔

شادی کے بعد آٹھ سال تک جب نواب مکرم کو اولاد نہ ہوئی تو لوگوں نے مشورہ دیا کہ نواب صاحب دوسری شادی کرلیں تاکہ کوئی اتنی بڑی جائداد اور دولت کا وارث بن سکے۔ ایک دن نواب صاحب کو افسردہ دیکھ کر بیگم نے بھی نواب صاحب سے کہا۔

''آپ ایک اور شادی کرلیں۔ یہ کوئی عیب تو نہیں۔ چار شادیوں کی اجازت تو مذہب نے بھی دی ہے۔ ویسے بھی سارے رئیس ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔''

نواب صاحب سن کر خاموش رہے۔ وہ دوسری شادی کے لئے آمادہ نہ تھے۔ علاج کراتے رہے۔ بزرگوں سے دعائیں بھی کراتے رہے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر اولاد قسمت میں ہے تو مل کر رہے گی۔ آخر دینے والے نے دعائیں سن لیں اور بیگم خوشنود مکرم شادی کے دس سال بعد امید سے ہوئیں۔ پوری حویلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملازمین اور حویلی کے

دوسرے افراد میں خوب مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔

قدرت کی مشیت اور مصلحت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ نواب صاحب ولادت سے تین ماہ قبل ہی اپنی بیگم کو لے کر شہر کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ہر ہفتہ بیگم کا معائنہ ہوتا اور ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کیا جاتا۔ جب ولادت کا وقت آیا تو بیگم کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ دو تین دن کی تکالیف کے بعد ایک خوبصورت سا بیٹا پیدا ہوا۔ نواب صاحب اور بیگم بہت خوش ہوئے۔ لیکن خوشی اور غم ہر گھر اور ہر زمانے میں رہا ہے۔ بچے کی پیدائش کے چند ہی دن بعد بیگم خوشنود مکرم کے قلب کی حرکت بند ہو گئی اور بغیر طبی امداد کے نواب صاحب کو داغِ مفارقت دے گئیں اور خوشی کا تانا بانا وقتی طور پر ٹوٹ گیا۔

نواب صاحب کو بیگم کا غم تو تھا ہی۔ انہیں بچے کی فکر پریشان کئے ہوئے تھی۔ آیا تو موجود تھی لیکن ماں کی موجودگی کی بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ بچے کے سلسلے میں ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ انسانی دودھ دیا جائے۔ ڈبے یا گائے بھینس کے دودھ سے نشو ونما بہتر طریقے سے نہیں ہو سکے گی۔ نواب صاحب فوراً شہر سے گاؤں آ گئے اور دودھ پلانے والیوں کو تلاش کیا گیا۔ کئی عورتیں نواب صاحب کی زیرِ عاطفت پلنے والی اس کام کے لئے آمادہ ہو گئیں۔ نواب صاحب نے ان میں سے دو تندرست دودھ پلانے والیوں کا انتخاب کیا۔ ایک دن کے لئے اور ایک رات کے لئے۔ اس طرح چھوٹے نواب خرم علی کی پرورش ہونے لگی۔ نواب صاحب خود بھی بہت توجہ دیتے۔ ذرا سی سردی گرمی ہوتی تو معالج کو طلب کر لیتے۔ بچے کی ہر عافیت کا خیال رکھتے۔ آیا اور دودھ پلانے والیوں کو بھی تاکید کرتے رہتے اور ان لوگوں کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھتے۔

چھوٹے نواب کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو نواب صاحب نے دھوم دھام سے رسمِ آمین کا اہتمام کیا اور ایک معقول استاد مقرر کیا۔ پڑھائی شروع ہوئی اور کلامِ پاک کے تیسوں پارے ختم ہوئے۔ اب دوسرے استاد مقرر ہوئے جو اردو، فارسی اور ابتدائی انگریزی کی تعلیم دینے لگے۔ جب اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم ایک معقول حد تک مکمل ہو گئی تو پڑھانے والوں نے

مشورہ دیا کہ چھوٹے نواب کو اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ لیکن نواب صاحب لڑکے کو حویلی سے باہر بھیجنے کے خلاف تھے۔ مبادا کوئی واقعہ نہ ہو جائے، کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔ لڑکے کا پڑھنا لکھنا، کھیلنا سب کچھ حویلی کے اندر ہی ہونا چاہئے۔

چنانچہ ہر مضمون کے لئے ایک ایک استاد رکھے گئے اور اس طرح چھوٹے نواب کو میٹرک کا امتحان دلوایا گیا۔ میٹرک پاس ہونے کے بعد کالج میں داخلے کا جب سوال اٹھا تو نواب صاحب نے کہا کہ کالج جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب خرم میاں کو امورِ ریاست سیکھنے کی ضرورت ہے، نواب صاحب کے فیصلے کے مطابق چھوٹے نواب روزانہ نواب صاحب کے ساتھ دس بجے صبح تا ایک بجے دن عوامی کچہری میں بیٹھتے اور امورِ ریاست سیکھتے۔ منشی سے حساب لیتے۔ منیجر سے دیگر معاملات پر گفتگو کرتے اور معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح چھوٹے نواب چار گھنٹے مصروف رہتے لیکن دن کے باقی اوقات گزارنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ نواب صاحب نے باہر جانے پر قدغن لگا رکھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو بھی کھیل ہو حویلی کے اندر ہی کھیلا جائے۔ ہر مصروفیت گھر کے اندر ہو۔

انسانی فطرت کے مطابق ہر شخص آزادی چاہتا ہے۔ خصوصاً ایک جوان لڑکا کھیل کود کے علاوہ مختلف تفریح چاہتا ہے۔ دنیا کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ دنیا میں حویلی کے باہر کیا ہو رہا ہے، اس سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ نواب صاحب سے جب باہر جانے پر اصرار کیا جاتا تو وہ کہتے:

''میں صرف اندرون حویلی کھیل اور تفریح کی اجازت دے سکتا ہوں۔ گھر سے باہر کھیل اور تفریح میں بہت سارے خطرات ہیں جو میں مول لینا نہیں چاہتا۔''

چھوٹے نواب گھر کے باہر کی دنیا سے بالکل نابلد تھے۔ حویلی کے باہر کیا ہو رہا ہے، انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ بچپن میں وہ حویلی کے اندر کھیلوں کے عادی تھے۔ وہ اپنے ہم عمر لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتے لیکن اب جوان ہونے کے بعد غلام گردش سے ہم عمر لڑکے جوان ہو کر

ادھر اُدھر ملازمت کی خاطر حویلی سے نکل گئے اور لڑکیاں بھی شادی کے بعد اپنے شوہر کے گھر جا بسیں۔ کچھ غیر شادی شدہ حویلی کی زینت بنی رہیں۔ چھوٹے نواب راجہ اندر کا کردار ادا کرتے اور گوپیوں کی شکل میں حویلی میں پلنے والی لڑکیاں جھومر ڈالا کرتیں۔

فطری طور پر بچپن کے Indoor games کا مفہوم جوانی میں آہستہ آہستہ تبدیل ہو گیا۔ نواب زادے نے بند کمرے کا کھیل شروع کر دیا۔ کھلاڑی کی کمی نہ تھی۔ حویلی کی مولازادیاں ایک اشارے پر کھیل میں شریک ہونے کے لئے تیار رہتیں۔ چھوٹے نواب جب چاہتے، جسے چاہتے اپنے کھیل میں شریک کر لیتے۔ کسی کو اعتراض نہ ہوتا کہ وہ سب اسی ماحول کی پروردہ تھیں اور چھوٹے نواب کی نوازشوں کی محتاج بھی۔

وقت گزرتا گیا اور چھوٹے نواب کا کھیل جاری رہا۔ نتیجتاً ان کی صحت دن بدن گرنے لگی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ سیب جیسے سرخ و سفید رخسار زرد پڑ گئے۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ پھیکے پڑ گئے۔ خرم میاں ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح دکھائی دینے لگے۔ ان کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر نواب صاحب بہت فکرمند ہوئے اور خاندانی حکیم کو طلب کیا۔ حکیم صاحب نے معائنہ کیا اور ضروری دوائیں دیں۔ حکیم صاحب نے نواب صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ برخوردار کی شادی کر دیں۔

نواب زادے کی شادی جلد اور آسانی سے نہیں ہوتی۔ لہٰذا نواب صاحب کے لئے فوراً شادی کرنی ممکن نہ تھی۔ ویسے انہوں نے جستجو شروع کر دی۔ نواب صاحب کو چھوٹے نواب کی بیماری کی اصل وجہ کون بتاتا۔ پوری حویلی تو چھوٹے نواب سے ملی ہوئی تھی۔

یہ سلسلہ بدستور کچھ دن اور چلتا رہا۔ پھر چھوٹے نواب شدید بیمار ہو گئے۔ انہیں سخت بخار آ گیا اور ساتھ ہی شدید کھانسی شروع ہو گئی۔ نواب صاحب کو تشویش ہوئی اور فوراً ڈاکٹروں کو بلا کر مشورہ کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے چھوٹے نواب کے معائنے کے بعد Chest X-ray اور خون جانچ کرانے کی ضرورت محسوس کی۔ چونکہ یہ سہولتیں وہاں میسر نہ تھیں اس لئے چھوٹے نواب کو

شہر لے جانے پر اصرار کیا جہاں بہتر طبی سہولتیں موجود تھیں ۔نواب صاحب فوراً شہر روانہ ہو گئے اور وہاں کے ممتاز ترین معالج سے علاج شروع ہوا۔ کچھ دنوں کے علاج کے بعد خرم میاں صحت یاب ہو گئے لیکن کمزوری باقی رہ گئی ۔ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ چھوٹے نواب کو لے کر کسی پہاڑی صحت گاہ پر جائیں جہاں بہتر آب وہوا میں وہ کلی طور پر صحتمند ہو جائیں گے ۔کھانے پینے کا بھی خاص خیال رکھنا ہو گا۔

چنانچہ نواب صاحب خرم میاں کو ایک مشہور پہاڑی صحت گاہ پر لے گئے اور تین ماہ مقیم رہنے کے بعد چھوٹے نواب بہر صورت صحت مند ہو گئے ۔خرم میاں کے بار بار اصرار کرنے پر نواب صاحب واپس حویلی آ گئے ۔

نواب صاحب کے خاص خیال رکھنے کے باوجود چھوٹے نواب تجدید مشاغل میں لگ گئے ۔دو ہی ماہ کے بعد چھوٹے نواب کی صحت پھر تشویشناک ہو گئی ۔نواب صاحب پھر انہیں لے کر شہر روانہ ہو گئے ۔ایک ماہ مستقل علاج کے بعد بھی کوئی افاقہ نہ ہوا تو ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ بیرون ملک لے جائیں ۔چنانچہ نواب صاحب ضروری انتظامات کے بعد لندن چلے گئے ۔لندن میں بھی دو ماہ کے علاج کے باوجود کوئی بہتری کی صورت نظر نہ آئی ۔خرم میاں کی صحت دن بہ دن بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ۔آخر میں ڈاکٹروں نے نواب صاحب کو بتایا کہ چھوٹے نواب کو پھیپھڑے کا سرطان ہو گیا ہے اور مشکل سے ایک ڈیڑھ ماہ اور سانس لے سکیں گے ۔

نواب صاحب مایوس ہو کر خرم میاں کو لے کر حویلی آ گئے ۔علاج ہوتا رہا لیکن ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق ایک ماہ کے اندر اندر ہی چھوٹے نواب کی سانس بند ہو گئی اور نواب صاحب کی حویلی سونی ہو گئی ۔

نواب صاحب رو رو کر سب سے کہتے:

”چھوٹے نواب کی موت میرے حد سے زیادہ احتیاط ، پیار ، بے جا تحفظ ، بے جا پابندی اور میری غفلتوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ہوئی ۔اللہ مجھے معاف کرے ۔میں ہی اپنے بیٹے کا قاتل ہوں ۔یا

اللہ میں تیری مرضی کے آگے بے بس ہوں۔''

نواب صاحب نے چھوٹے نواب کی یاد میں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ کافی زمین بھی مقبرے کے ٹرسٹ کے نام وقف کر دی گئی۔ مقبرے کی تعمیر، تزئین و آرائش خود نواب صاحب نے اپنی نگرانی میں کرائی۔ مقبرے کے ساتھ ہی ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی۔ جو ادھر سے گزرتا مسجد میں نماز پڑھتا اور مقبرے کی زیارت کرتا۔ کمزور عقیدے کے لوگ پختہ مقبرہ دیکھ کر نفسیاتی طور پر یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ وہ مقبرہ کسی بزرگ کا ہی ہے، چاہے اس مقبرے میں ولی کی جگہ کوئی شیطان ہی کیوں نہ مدفون ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے زیارت کرنے والوں اور مرادیں مانگنے والوں کا ہجوم ہونے لگا۔ سالانہ عرس ہونے لگا۔ مزار پر قوالی ہونے لگی۔ چرسی مستان بھنگڑا ڈالنے لگے۔ طوائفیں مجرا کرنے لگیں۔ فقیروں اور محتاجوں کی یورش ہونے لگی۔ لنگر خانے سے کھانے بھی تقسیم ہونے لگے۔ ہر وہ بدعت ہونے لگی جو عموماً مزاروں اور مقبروں پر ہوتی ہے۔

چھوٹے نواب کے مقبرے پر یہ گہما گہمی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کل کے بند کمرے کا کھلاڑی آج مرجعِ خلائق بنا ہوا ہے۔

☆☆☆

دلاور

سرمد خاں فوج میں صوبہ دار تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں جرمن سے لڑائی میں تیونس کے محاذ پر مارا گیا۔ اس کے پس ماندگان میں ایک بیوہ اور ایک ڈھائی سال کا بچہ دلاور باقی رہے۔ جب سرمد خاں محاذ پر گیا تھا تو اس وقت دلاور کی عمر دو سال تھی۔ سرمد خاں کی موت کی خبر سرکاری ذریعہ سے ہوئی۔ از راہ کرم سرکار نے سرمد خاں کی بیوہ کو مبلغ پچیس روپیہ خاص پینشن عطا فرمائی۔ سرمد خاں کی بیوہ اسی پچیس روپے پینشن اور کچھ ذاتی جائداد کی آمدنی پر گزر کرنے لگی۔

دلاور جب چار سال کا ہوا تو اسے قرآنی تعلیم کے لئے مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھنے لگا۔ یہاں سے فارغ ہوا تو گاؤں سے کچھ فاصلے پر قائم مڈل اسکول میں داخل ہوا اور اچھے نمبروں سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اس کی پڑھائی رک گئی کیونکہ گاؤں کے قریب کوئی ہائی اسکول نہ تھا اور شہر بھیج کر پڑھانے کے لئے مالی استطاعت نہ تھی۔ نتیجتاً دلاور یوں ہی بیکار بیٹھ کر وقت گزارنے لگا۔ جب وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو اس نے ماں سے کہا۔

''اب میں بڑا ہو گیا ہوں، شہر جا کر ملازمت کروں گا۔''

ماں نے اجازت دے دی اور ایک معقول رقم بھی ساتھ کر دی۔

دلاور شہر میں اپنے ایک رشتے کے ماموں کے پاس ٹھہرا۔ ماموں نے خوش دلی سے اسے اپنے پاس رکھا۔

''بیٹا ملازمت کا حصول تو بہت دشوار کام ہے۔ لیکن دفتر اور بازار کے چکر لگاتے رہو۔ دیکھو قسمت

کب یاوری کرے۔'' ماموں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

دلاور روزانہ مختلف دفاتر، کارخانے اور بازار کی خاک چھاننے لگا۔ ایک دن معمول کے مطابق بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک پولیس انسپکٹر نے اسے مخاطب کیا۔

''یہ ٹوکری اٹھاؤ اور موبائل تک پہنچا دو۔''

دلاور نے کہا۔'' میں مزدور نہیں ہوں۔ میں ملازمت کی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔''

پولیس انسپکٹر نے گالی دیتے ہوئے کہا۔'' ملازمت کا بچہ، ٹوکری اٹھاتا ہے یا دوں ایک لات۔''

دلاور نے پھر کہا کہ وہ مزدور نہیں ہے اس لئے ٹوکری نہیں اٹھائے گا۔ انسپکٹر نے ایک آدمی سے کہا دیکھو چوراہے پر پولیس موبائیل ہے، وہاں جا کر کہو کہ دو بندے فوراً بازار انسپکٹر کے پاس آجائیں۔ چند لمحوں بعد دو بندے حاضر ہو گئے۔ انسپکٹر نے دلاور کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس کو لے جاؤ اور اس نواب کے بچے کو سبق سکھاؤ اور بتاؤ کہ پولیس سے منہ ماری میں کیا ہوتا ہے۔

دونوں سپاہی دلاور کو پکڑ کر لے گئے اور نہ معلوم کیا الزام لگایا کہ عدالت میں دو پیشی کے بعد دلاور کو چھ ماہ کی سزا ہو گئی اور جیل بھیج دیا گیا۔ ماں کو خبر ہوئی تو وہ پریشان حال شہر پہنچ گئی۔ اس کے ماموں نے بھی اپنی بساط کے مطابق کوشش کی مگر سب بے سود۔ ماں تو رو پیٹ کر گاؤں واپس چلی گئی اور دلاور اپنی قید کی مدت پوری کرنے میں لگا رہا۔ دلاور نے جیل ہی میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ رہائی کے بعد پولیس کے ظلم کا بدلہ ضرور لے گا۔ انتقام کی آگ اس کے سینے میں شعلہ بن کر دہک رہی تھی۔

دلاور جیل سے رہا ہو کر سیدھے اپنے ماموں کے پاس آیا۔ ماموں کا کمرہ بند ملا۔ وہ اس وقت تک اپنی ملازمت سے واپس نہیں آیا تھا۔ دلاور وہیں باہر بیٹھ کر انتظار کرتا رہا۔ ماموں مغرب کے بعد آیا تو اپنے دلاور کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سینے سے لگا لیا۔

''ماموں میں اب اپنے گاؤں جاؤں گا۔'' دلاور نے ماموں سے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے وہاں جا کر کچھ دن آرام کر لے۔ حالات یہاں کچھ موافق ہوں تو آجانا۔'' ماموں نے کہا۔

دلاور رات بھر وہیں اپنے ماموں کے ساتھ رہا۔ صبح سویرے ہی اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوگیا۔ دلاور گھر پہنچا تو اس کی ماں نے روتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔

''میرے لعل، اب تجھے شہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مولا نے جو کچھ دیا ہے اسی پر ہم گزارہ کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے ماں لیکن میں ظلم کا بدلہ ضرور لوں گا۔ جب تک میں انتقام نہ لے لوں گا مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

''ظالموں سے الجھنا ٹھیک نہیں بیٹا۔ یہ سب اللہ پر چھوڑ دے۔''

''اللہ میاں خود تو بدلہ لینے آئیں گے نہیں، ان ظالموں کی سرکوبی تو ہم جیسے بندوں ہی کے ذریعہ کروائیں گے۔''

دلاور منصوبہ بنا چکا تھا۔ وہ روزانہ ورزش کرتا۔ اوپر نیچے چھلانگیں لگتا۔ باپ کی رکھی ہوئی رائفل سے نشانے لگاتا۔ غرض دن رات وہ اپنی جسمانی طاقت اور ذہانت کو جلا دینے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے روپ بھرنے کا فن بھی سیکھا۔ کبھی سادھو کا بھیس، کبھی مزدور، کبھی فقیر اور کبھی سوٹ ٹائی میں صاحب بن جانے کا فن بھی سیکھتا رہا۔ کبھی گھنی مونچھیں اور کبھی مصنوعی داڑھی لگا کر بھیس بدلنے کے گر بھی سیکھتا۔ ایک سال کی محنت کے بعد اس نے اندازہ لگالیا کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لائق ہوگیا ہے۔ اس کا مقصد صرف پولیس کو لوٹنا، ہراساں کرنا اور تھانے پر اچانک حملہ کرنا وغیرہ تھا۔

چنانچہ دلاور اپنے انتقامی منصوبے کی روشنی میں ایک ڈی ایس پی کے مکان میں گرل کاٹ کر داخل ہوا۔ گھر کے سوئے ہوئے افراد کو جگایا اور پستول دکھا کر باورچی خانے میں بند کردیا اور دھمکی دی کہ کسی نے آواز نکالی تو اس کی خیر نہیں۔ تمام الماریوں کی چابیاں لوگوں سے لے کر گھر میں جو کچھ نقدی یا زیورات کی شکل میں اسے دستیاب ہوئے انہیں اکٹھا کر روانہ ہوگیا۔ یہ اس کے منصوبے کی پہلی کارروائی تھی جو کامیاب رہی۔ صبح ہوتے ہی ہنگامہ ہوگیا کہ پولیس افسر کے گھر ڈاکہ پڑ گیا۔ اخبار والوں نے اس واقعہ کو کافی اچھالا۔ پولیس کے لئے یہ واقعہ خفت کا باعث ہوا۔

پولیس انکوائری میں ایک پرچی ملی جو گھر میں ٹیبل پر رکھ کر پیپر ویٹ سے دبا دیا گیا تھا جس میں لکھا تھا۔

''پولیس سے انتقام کی پہلی قسط۔ دلاور''

کچھ دن خاموش رہنے کے بعد دلاور نے ایک پولیس تھانے پر حملہ کیا۔ اس نے رات کے وقت چپکے سے تھانے کے احاطے میں آکر ایک دستی بم پھینک کر تھانے میں بیٹھے کئی پولیس اور پولیس افسر کو نشانہ بنایا اور اخبار کے دفتر میں ٹیلی فون کر دیا'' پولیس سے انتقام کی دوسری قسط۔ دلاور۔''

صبح سویرے اخبار میں خبر آگئی کہ اب تو تھانہ بھی دلاور ڈاکو کی زد سے نہیں بچا۔ پولیس پریشان تھی۔ دلاور کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا کہ یہ کون ہے، کہاں رہتا ہے، اس کے کتنے ساتھی ہیں۔ عینی شاہد کے مطابق دلاور کا جو حلیہ بنتا وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا۔ وہی روپ بہروپ کی حکمت عملی کارفرما تھی۔ وقفہ وقفہ سے دلاور کبھی کسی پولیس انسپکٹر کے گھر اور کبھی کسی داروغہ کے گھر واردات کرتا اور اپنے نام کی پرچی چھوڑ جاتا۔ صبح اخبار والے بڑھا چڑھا کر لکھتے کہ پولیس والوں کی بکی ہوتی ہے اور عوام میں خوف وہراس پھیلتا ہے۔

دلاور کو جو زر و مال ملتا وہ گاؤں کے غریب اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔ واردات جب زیادہ بڑھنے لگے تو دلاور کے سر کی قیمت سرکار نے دس لاکھ روپے لگا دی۔ دلاور کبھی اس شہر میں کبھی اُس شہر میں پتہ لگا کر پولیس والوں کے گھر میں مختلف عنوان سے گھس جاتا اور واردات کے بعد قسط نمبر اور دلاور لکھ کر آجاتا۔ دوسرے دن اخبار والے بڑھا چڑھا کر خبر چھاپتے اور پولیس کے حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی اور دلاور کو پکڑنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے بنتے مگر سب بے سود۔ دلاور کا کوئی سراغ نہ ملتا۔ واردات کے ساتھ ساتھ انعام کی رقم بھی بڑھتی گئی اور پچیس لاکھ تک جا پہنچی۔

ایک رات پتہ لگا کر دلاور آئی جی پولیس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ گیٹ پر تعینات دو گارڈ سوئے کے سوئے رہ گئے اور دلاور چہار دیواری پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کا

تالا توڑا اور حسب معمول اسلحہ کے زور پر سب کو خوفزدہ کرنے کے بعد پوچھا۔
''آپ لوگوں میں آئی جی صاحب کون ہیں؟''
ایک گھنی مونچھوں والے ادھیڑ عمر صاحب نے کہا۔''میں ہوں۔''
دلاور نے کہا۔''حضور پولیس نے مجھے بے قصور پکڑ کر چھ مہینے کے لئے جیل بھجوا دیا۔ میں پیشہ ور ڈاکو نہیں ہوں بلکہ اسی ناروا سلوک اور ظلم کی پاداش میں یہ انتقامی کارروائیاں کرتا پھر رہا ہوں۔ اس ناچیز کو دلاور کہتے ہیں۔ آپ مجھے گرفتار کرلیں اور پچیس لاکھ روپے کا انعام وصول کرلیں۔''

دلاور نے کچھ اس ڈرامائی انداز میں کہا کہ آئی جی صاحب بہت متاثر ہوئے اور کہا۔''بیٹا یہ کام تم چھوڑ دو۔ انتقام کی آگ میں آدمی خود بھی جلتا ہے اور دوسروں کو بھی جلاتا ہے۔ تم کو اس گھر کی جو چیز پسند آئے لے جاؤ لیکن کسی کو گزند نہ پہنچاؤ۔ میں تمہیں اپنے گھر میں گرفتار نہیں کروں گا۔ اگر ہو سکا تو باضابطہ تمہیں گرفتار کروں گا۔ تم جس طرح اندر آئے ہو اسی طرح واپس چلے جاؤ۔''
دلاور نے کہا۔''آپ نے مجھے بیٹا کہہ کر میرے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ اس وقت اس گھر کی ہر چیز مجھ پر حرام ہے۔ خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر وہ اسی طرح چہار دیواری پھلانگ کر باہر نکل گیا۔

اگلے روز آئی جی صاحب نے تمام پولیس افسروں کی میٹنگ بلائی اور کہا آج سے تین چار سال کا ریکارڈ دیکھو، کوئی دلاور نام کے آدمی کا چالان ہوا تھا جسے چھ ماہ کی سزا بھی ہوئی تھی۔ تمام تھانے کا ریکارڈ چیک کرو اور تین دنوں کے اندر رپورٹ پیش کرو۔ تمام تھانے والے اپنے اپنے ریکارڈ چیک کرنے لگے اور ایک تھانے میں دلاور کا ریکارڈ مل گیا۔ باپ کا نام، آبائی گاؤں کا پتہ، مقامی رہائش گاہ کا پتہ وغیرہ۔ تفصیل مل جانے کے بعد آئی جی نے ایک ٹیم تشکیل دی اور دلاور کی گرفتاری کا منصوبہ بنا کر دلاور کے آبائی گاؤں اور مقامی رہائش گاہ پر چھاپہ مارا گیا۔ گاؤں والوں کو پتہ تھا کہ دلاور وارداتیں کرتا ہے لیکن وہ گاؤں والوں کی اتنی خدمت کرتا تھا کہ گاؤں کے سارے افراد اس پر جان چھڑکتے تھے۔ نتیجتاً گاؤں والوں نے دلاور کو ایسا چھپایا کہ پولیس ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی اور واپس چلی گئی۔

پولیس کا چھاپہ اب ایک معمول بن گیا تھا۔ گاؤں والوں کو اور خاص کر دلاور کی ماں کو فکر لاحق ہوگئی۔ وہ ایک عرصے سے دلاور کو یہ دھندا چھوڑنے کے لئے کہہ رہی تھی لیکن وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا جو ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ دلاور کی ماں اسی فکر و پریشانی میں بیمار ہوگئی۔ دلاور نے اس کے علاج کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا لیکن کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ اس نے سوچا چلو گاؤں کے مولوی صاحب سے دعا کرائیں اور پانی پڑھوا کر لائیں۔ وہ امام صاحب کے پاس گاؤں کی مسجد گیا اور مولانا سے دعا کی درخواست کی۔ مولانا نے کہا تیری ماں نیک خاتون ہیں، میں ان کے لئے دعا ضرور کروں گا لیکن دلاور تو اب ہوش میں آجا۔ تو جو دھندا کر رہا ہے یہ درست نہیں۔ تو غلط راہ پر چل رہا ہے۔ انتقام اس سے لیا جاتا ہے جس نے تجھے تکلیف پہنچائی ہے اور اسی حد تک جس حد تک اس نے نقصان کیا ہے۔ یہ نہیں کہ انتقام کے جنون میں جس کو چاہا لوٹا یا مارا۔ میں جانتا ہوں کہ تو جو کچھ لاتا ہے وہ سب غریبوں کی مدد پر خرچ کر دیتا ہے لیکن جو مال تو لاتا ہے وہ ناجائز ہے اور اسی حرام مال سے تو لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ تو خود بھی گنہگار ہوتا ہے اور دوسروں کی بھی عاقبت خراب کرتا ہے۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ خدا کے واسطے توبہ کر اور زندگی بھر کرتا رہ تاکہ اللہ تیرے گناہوں کو معاف فرمائے۔

ان نصیحتوں کے بعد مولوی صاحب نے پانی دم کر کے دیا اور کہا لے جا ماں کو پلا دے۔ دلاور گھر واپس آیا اور ماں کو پانی پلاتے وقت اس نے مولوی صاحب کی ساری باتیں ماں کو سنا دیں۔ ماں نے کہا مولوی صاحب ٹھیک کہتے ہیں تو باز آجا ورنہ میں تیرا دودھ نہیں بخشوں گی۔ دلاور کچھ دیر خاموش رہا اور اس نے ماں سے کہا۔

''اماں، میں توبہ کرتا ہوں۔ اب میں شہر جا کر یا کہیں کوئی واردات نہیں کروں گا۔ تو میرے لئے دعا کر اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔''

تین چار دنوں کے بعد دلاور کی ماں صحت یاب ہوگئی تو دلاور کو اطمینان ہوا۔ دلاور اب گاؤں ہی میں رہتا۔ پولیس کا چھاپہ پڑتا تو گاؤں والے اسے بچا لے جاتے۔ وہ بھی بھیس بدل کر رہتا اور پولیس آتی، گاؤں کی تلاشی لیتی اور چلی جاتی۔ پولیس نے بہت کوشش کی کہ گاؤں میں

کوئی اس کا کھوجی نکل آئے لیکن بے سود۔

گاؤں میں زبردست طوفان آیا۔ اکثر لوگوں کے گھر متاثر ہوئے۔ دلاور کے گھر کا ایک حصہ تباہ ہوگیا اور ایک دیوار گرنے سے اس کی ماں شہید ہوگئی۔ گاؤں میں اور بھی اسی طرح کئی اموات ہوگئیں۔ دلاور کو ماں کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا لیکن گاؤں کے اور لوگوں کی موت کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے اسے آفاتِ سماوی سمجھ کر صبر کرلیا اور گاؤں کے لوگوں کی مدد میں لگ گیا۔ اس بادوباراں کے بعد زبردست سیلاب آ گیا۔ کئی گاؤں سیلاب کی نذر ہو گئے۔ دلاور کا گاؤں بھی بہت متاثر ہوا۔ لوگوں کے گھر گر گئے۔ گھر کا سامان پانی کی لہروں میں بہہ گیا۔ کھیتیاں خراب ہوگئیں۔ قحط کی صورت پیدا ہوگئی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ سرکار سے کوئی مدد نہ ملی۔ ایسی صورت میں دلاور بہت پریشان تھا کہ گاؤں والوں کی وہ کیسے مدد کرے۔ سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے گاؤں کے بزرگ اور چند معتبر لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان لوگوں سے کہا کہ گاؤں والوں کو بچانے کے لئے میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ آپ لوگوں کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔ گاؤں کے بہت ہی مخلص اور ایمان دار کبیر الدین صاحب نے پوچھا۔

''وہ منصوبہ کیا ہے؟''

دلاور نے کہا۔'' چاچا، گاؤں والوں کی مدد کے لئے کافی رقم چاہئے اور اس رقم کی فراہمی کے لئے ایک ہی صورت ہے۔ آپ لوگ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں اور انعام کے پچیس لاکھ روپے وصول کرلیں۔ اس رقم سے گاؤں کے لوگوں کی مدد ہو جائے گی۔''

''دلاور، یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔'' کبیر الدین صاحب نے کہا۔'' اب تک تو ہم لوگوں نے تجھ پر آنچ نہ آنے دی اور آج ہم تیرا ہی سودا کرلیں۔ کیا ہم لوگ اتنے بے غیرت ہو گئے ہیں۔''

''چاچا، اب میں کمزور ہو گیا ہوں۔ پولیس سے زیادہ دن بچ نہیں سکوں گا۔ اگر کسی دن ان کے ہاتھ لگ گیا تو یہ انعام میرے دشمنوں کو مل جائیگا۔ کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ دشمنوں کو فائدہ پہنچے۔ اگر آپ لوگ یہ نہیں کریں گے تو میں خود پولیس کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھ سے گاؤں والوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔''

دلاور انہیں راضی کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔

دلاور کے مشورہ کے مطابق اخبار میں خبر چھپوائی گئی۔ دلاور کبیر الدین کے قبضے میں درج ذیل پتہ پر موجود ہے۔ اگر سرکار کو اس کی ضرورت ہے تو سرکار کے آدمی آ کر لے جائیں اور ساتھ ہی انعام کی پچیس لاکھ کی رقم بھی دیتے جائیں۔

''اخبار میں خبر چھپ جانے سے روپیہ پولیس ہضم نہیں کر سکے گی۔ وہ رقم کبیر چاچا کو ہی ملے گی۔'' دلاور نے بتایا۔

خبر پڑھتے ہی کئی ٹرک پولیس، ایس پی پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گاؤں پہنچ گئے اور کبیر الدین سے رابطہ کے بعد دلاور کو طلب کیا۔ کبیر الدین نے کہا۔

''میں حاضر کر دوں گا لیکن پہلے آپ انعام کی رقم اور دلاور کی گرفتاری کا معاہدہ کر لیں۔''

معاہدہ ہوا کہ پچیس لاکھ کی رقم کبیر الدین صاحب کو دے دی جائے گی اور دلاور کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

دلاور کو پا بہ زنجیر لایا گیا اور پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد انعام کا چیک کبیر الدین کے نام آ گیا۔ روپے سے گاؤں والوں کی مدد شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کے گھر بن گئے اور دو وقت کی روٹی ملنے لگی۔ کبیر چاچا بہت ہی دیانت داری سے یہ کام سر انجام دے رہے تھے۔

دلاور پر مقدمہ چلا۔ اس پر سیکڑوں الزام تھے۔ آخر دلاور کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ گاؤں کے لوگ ملنے گئے تو دلاور نے کہا۔

''مجھے اپنے کیے کی سزا تو ملنی ہی تھی۔ میں مطمئن ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے اور میرے گاؤں والوں کو خوش رکھے۔''

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

غیاث احمد اوسط درجے کے کاروباری تھے۔ ان کی شادی سلطانہ بیگم سے ہوئی تھی۔ شادی کے دو سال بعد اللہ نے ایک خوبصورت بیٹا عطا کیا جس کا نام سکندر اعظم رکھا گیا۔ ابھی سکندر چار سال ہی کا تھا کہ ماں کی شفقت سے محروم ہوگیا۔ ماں کے بعد اس کی پرورش کا ذمہ اس کی دادی نے لے لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی دادی بھی رخصت ہوگئیں۔ اب گھر میں سوائے نوکرانی کے عورت کی صورت میں کوئی نہ رہا۔ غیاث صاحب کاروبار میں الجھے رہتے۔ انہیں کہاں فرصت کہ سکندر کی طرف توجہ دیں۔

لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرلیں تاکہ گھر کا نظام سنبھل جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دوشیزہ سے شادی کرلی اور گھر میں قدرے رونق آگئی۔ سکندر کا داخلہ بھی اسکول میں ہوگیا۔ وہ بھی اسکول جانے لگا اور ماں اور دادی کی یاد بھی اسے اب کم ستانے لگی۔

سکندر کی کمزوری یہ تھی کہ بستر پر اکثر پیشاب کردیا کرتا تھا۔ نوکرانی کا کام تھا سکندر کو غسل کروانا، کپڑے تبدیل کروانا، بستر کو دھوپ میں ڈالنا، پلاسٹک کی شیٹ کو صاف کرنا وغیرہ۔ چونکہ یہ سارے کام ملازمہ کے ذمے تھے اس لئے غیاث صاحب اور ان کی بیگم کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ گھر کا کاروبار اسی معمول سے چلتا رہا۔

ایک رات سکندر باپ کے انتظار میں غیاث صاحب کے پلنگ پر سوگیا۔ کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ جب رات کے دس بجے غیاث صاحب آئے تو سکندر کو اٹھایا گیا لیکن اس وقت تک سکندر باپ کا بستر پیشاب سے خراب کرچکا تھا۔ غیاث صاحب کو بیٹے کی یہ حرکت ناگوار

گزری اور اتنا برہم ہوئے کہ اسے مار پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ دسمبر کی سرد رات، پیشاب سے گیلا کپڑا، سکندر دروازے سے لگا روتا رہا اور سردی سے کانپتا رہا۔ دروازہ کھولنے کی التجا کرتا رہا لیکن اس معصوم کی آواز پر کسی نے توجہ نہ دی۔ جب سکندر کے رونے کی آواز متصل مکان میں حاجی فیروز الدین تک پہنچی تو انہیں تشویش ہوئی۔ وہ اپنے گھر سے باہر نکل آئے اور سکندر کو پریشان حال دیکھا۔ حاجی صاحب نے اس کی اس حالت کا سبب پوچھا تو سکندر نے بتایا:

''مجھ سے بستر پر پیشاب ہو گیا تھا اس لئے مجھے نکال دیا گیا ہے۔''

حاجی صاحب کو بچے پر ترس آیا اور اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آئے۔ اس کے کپڑے تبدیل کئے اور اسے پیشاب کرا کر ایک بستر پر لحاف میں لپیٹ کر سلا دیا۔

حاجی صاحب فجر کی نماز کے لئے اٹھے تو نماز کے بعد وہ انتظار کرتے رہے کہ غیاث احمد جب بیدار ہو جائیں تو ان سے استفسار کیا جائے۔ تقریباً آٹھ بجے حاجی صاحب نے غیاث احمد کو آواز دی۔ جب وہ باہر آئے تو حاجی صاحب برس پڑے۔

''بے ماں کے معصوم بچے کے ساتھ آپ یہ سلوک کرتے ہیں؟ کیا وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے؟ کیا وہ اسی ظالمانہ سلوک کا مستحق ہے؟''

غیاث صاحب حاجی صاحب کی سخت سست سنتے رہے اور خاموش رہے۔ وہ اپنی حرکت پر نادم تھے۔ حاجی صاحب سے بس اتنا کہا۔ ''آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سکندر ہے کہاں، اسے بھیج دیجئے۔''

''وہ سو رہا ہے، اٹھے گا تو بھیج دوں گا۔'' حاجی صاحب نے کہا۔ ''بھائی آپ اس کا علاج کرائیں اور آئندہ اس کا پورا پورا خیال رکھیں۔ وہ آپ کی اولاد ہے، آپ کا وارث ہے، اس کی دیکھ بھال آپ پر فرض ہے۔''

سکندر اس روز دیر سے سو کر اٹھا۔ اس کی ملازمہ کئی بار حاجی صاحب کے گھر اسے لانے گئی اور واپس آ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ سکندر کہیں حاجی صاحب کے یہاں بستر پر پیشاب نہ کر دے۔ آخر اس نے سکندر کو بیدار کر دیا اور گھر لے آئی۔ سکندر سہما سہما گھر کے اندر داخل ہوا۔ ملازمہ حسبِ

حکم سکندر کو لے کر سیدھے غیاث صاحب کے پاس پہنچی۔ غیاث صاحب نے اسے پاس بلایا اور شفقت سے پیش آئے اور کہا۔

''دیکھو آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا ورنہ اس سے بھی کڑی سزا ملے گی۔ جاؤ ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کر لو۔ اسکول کا وقت تو آج نکل گیا۔ کل سے اسکول وقت پر جانا۔''

سکندر خاموشی سے سنتا رہا۔

غیاث تو اپنے کاروباری سلسلے میں باہر چلے گئے اور یہ سات سال کا بچہ کسی انجانے خوف سے مختلف زاویے سے سوچتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خالہ کے پاس لاہور چلا جائے گا۔ اس نے اپنی جمع شدہ رقم کا جائزہ لیا تو اس کے پاس خاصی رقم موجود تھی۔ اس نے ساری رقم جیب میں رکھی اور گھر سے نکل گیا۔ بس اسٹینڈ پر پہنچ کر اس نے پوچھا کہ ریلوے اسٹیشن کون سی بس جائے گی۔ ایک صاحب نے اس کی رہنمائی کی۔ اس نے اسٹیشن پہنچ کر دیکھا کہ لوگ سفر کے لئے ٹکٹ لے رہے ہیں۔ اس نے بھی لاہور کے لئے ٹکٹ خرید لیا۔ ریل گاڑی کے انتظار میں رہا۔ لوگوں سے بار بار پوچھتا کہ لاہور جانے والی گاڑی کب آئے گی اور وہ کون سی گاڑی ہے۔ لوگوں نے اس کی رہنمائی کی اور گاڑی آتے ہی وہ ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔

جب رات بھیگ گئی تو سکندر کو سردی محسوس ہونے لگی۔ اسے شال اور سوئٹر ناکافی محسوس ہونے لگا۔ وہ سردی سے کانپنے لگا۔ اسے پریشان دیکھ کر انور صاحب نے جو اپنی فیملی کے ساتھ لاہور جا رہے تھے، سکندر سے دریافت کیا۔

''بیٹا تم تنہا سفر کر رہے ہو؟''

''جی۔'' سکندر نے جواب دیا۔

''کہاں جاؤ گے؟''

''لاہور۔'' اس نے جواب دیا۔

''لاہور میں کون سی جگہ؟'' انور صاحب نے پوچھا۔

''خالہ کے یہاں جاؤں گا۔ میری خالہ لاہور میں رہتی ہیں۔''

انور صاحب نے اس کی گفتگو سے سمجھ لیا کہ لڑکا گھر سے یوں ہی نکل آیا ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''بیٹا تمہیں بھوک لگی ہے؟''

سکندر چپ رہا۔ انور صاحب اسے اپنے قریب نشست پر لے آئے۔ اسے کچھ کھانے کو دیا۔ پھر تھوڑی سی چائے دی اور کمبل میں لپیٹ کر سکندر کو کہا۔

''اب تم آرام سے سو جاؤ۔''

''میں پیشاب کر کے آتا ہوں، پھر سو جاؤں گا۔'' سکندر نے کہا۔

لاہور پہنچ کر انور نے کہا۔ ''بیٹا تم ہم لوگوں کے ساتھ چلو۔ تمہاری خالہ کا پتہ معلوم کر کے ان کے پاس پہنچا دوں گا۔''

''اگر میں آپ کے گھر جا کر بستر پر پیشاب کر دوں تو آپ ماریں گے تو نہیں؟''

''نہیں نہیں تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔'' انور صاحب نے کہا۔

ازراہِ ہمدردی انور صاحب سکندر کو اپنے گھر لے گئے اور تھانے میں ڈائری لکھوا دی کہ ایک لڑکا سکندر نام کا جس کی عمر سات سال ہوگی، لاہور آتے ہوئے ریل گاڑی میں بے سہارا تھا، اسے وہ اپنے ساتھ لے کر آ گئے ہیں۔ وہ لڑکا جس کا ہے وہ آ کر لے جائے۔ ہفتہ گزر گیا، کوئی اطلاع نہ آئی۔ انور نے اخبار میں بچے کی تصویر کے ساتھ ایک اشتہار دیا لیکن ہفتوں کوئی دعویدار نہ ملا۔

انور نے اپنی بیگم سے مشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ اس بے سہارا لڑکے کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کریں گے۔ اس کا علاج کروایا۔ اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ وقت بڑی تیزی سے گزرتا گیا۔ انور کا بیٹا اظہر اور سکندر دونوں نے تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کر لی۔ نہ سکندر کے باپ نے کوئی خبر لی اور نہ سکندر ہی کو ان کا خیال آیا۔ دونوں ایک دوسرے کو فراموش کر چکے تھے۔

اظہر تو لاہور ہی میں رہا لیکن سکندر کراچی آغا خاں ہسپتال میں ملازم ہو گیا اور ساتھ ساتھ پوسٹ گریجویشن کی تیاری بھی کرتا رہا۔ ایک دن کمرہ نمبر ۲۲۴ میں جب معمول کے مطابق

مریض کو دیکھنے گیا تو مریض پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گیا اور پچیس سال پیچھے کا منظر اس کے سامنے آ گیا۔ اس کو ایسا لگا کہ مریض اس کا باپ غیاث الدین ہے۔ جب اس نے مریض کے نام اور کوائف پڑھے تو گمان یقین میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ جذباتی کیفیت میں سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوچا کہ ماضی کو کریدنے سے بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

''میرا باپ تو وہ ہے جس نے مجھے سہارا دیا۔ میری پرورش کی، مجھے پروان چڑھایا اور آج میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں، اور اپنے ماضی کو بھول کر حال میں مگن ہوں۔''

شام کو جب وہ پھر کمرہ نمبر ۲۲۴ میں گیا تو دیکھا کہ بیگم غیاث بھی وہاں موجود ہیں۔ سکندر نے انہیں بھی پہچان لیا۔ سکندر میں اتنی تبدیلی آ گئی تھی کہ اسے نہ غیاث احمد نے پہچانا اور نہ ان کی بیگم نے۔ لیکن جب کوئی ڈاکٹر سکندر کو آواز دیتا تو غیاث احمد صاحب کو اپنا کھویا ہوا بیٹا یاد آ جاتا اور ایک چوٹ سی دل میں لگتی۔ غیاث احمد تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں رہے تو ڈاکٹر سکندر سے کافی قربت ہو گئی۔ وہ سکندر کو ڈاکٹر نہیں بلکہ بیٹا کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتے۔ سکندر بھی ان کا بے حد خیال رکھتا۔

انور نے سکندر کی شادی لاہور میں ایک ڈاکٹر لڑکی سے طے کر دی۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی اور کارڈ لوگوں میں تقسیم ہونے لگے تو سکندر نے ایک کارڈ غیاث احمد صاحب کو بھی بھجوا دیا۔ لفافے میں انور کی طرف سے ایک خط بھی شامل کر دیا کہ آپ کے ڈاکٹر سکندر اعظم کی شادی ہو رہی ہے، آپ مع بیگم کے شریک ہو کر زینت بخشیں اور ہم لوگوں کو شکریہ کا موقع عطا فرمائیں۔

دعوت نامہ ملتے ہی غیاث صاحب نے اپنی بیگم سے مشورہ کیا اور شادی میں شریک ہونے کا پروگرام بنایا۔ تقریب میں شریک ہوئے۔ غیاث صاحب کو انور نے اپنے ساتھ ہی اسٹیج پر بٹھایا۔ نکاح نامہ کے خانے پر کرتے وقت ولدیت میں بجائے انور کے غیاث احمد کا نام لکھا گیا۔ غیاث صاحب پر تو اس وقت بجلی گر پڑی اور یہ ان پر منکشف ہوا کہ ڈاکٹر سکندر ان کا کھویا ہوا بیٹا ہے۔ وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہو گئے کہ اب ان کا ردِ عمل کیا ہو۔

تقریب ختم ہونے کے بعد غیاث احمد نے سکندر کو اس طرح گلے سے لگایا اور بھینچا کہ

دونوں جذباتی ہو گئے اور بڑی مشکل سے دونوں نے اپنے جذبات پر قابو پایا۔

ولیمے کی تقریب کے بعد غیاث احمد اپنی بیگم کے ساتھ صاحب خانہ اور سکندر سے رسمی ملاقات کے بعد واپس ہوئے۔ راستے میں غیاث نے اپنی بیگم سے کہا۔

''یہ سکندر میرا کھویا ہوا بیٹا ہے۔''

''مجھے بھی ہسپتال میں قیام کے دوران کچھ کچھ شک ہوا تھا لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کہ وجہ سے خاموش رہی۔''

''اب اسے کیسے حاصل کیا جائے؟ کیا کہوں اور کس سے کہوں؟ کہیں ماضی کی تلخیاں سامنے نہ آجائیں؟'' غیاث احمد نے کہا۔

بیگم بولیں۔ ''خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ماضی کے گڑے مردے اکھڑیں گے اور سوائے رسوائی اور پشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

''بیگم آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' غیاث احمد بولے۔ ''گوئم مشکل وگرنہ گوئم مشکل۔''

☆☆☆

دیر ہے اندھیر نہیں

فرید احمد وفاقی حکومت میں اوسط درجہ کے ملازم تھے۔ ان کا پورا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ فرید احمد، ان کی بیگم اور دو بیٹیاں فرزانہ اور ریحانہ۔ اپنی دال روٹی میں یہ کنبہ خوش تھا۔ لڑکیوں کو پڑھایا، لکھایا اور بی۔اے تک کی تعلیم دلوائی۔ دونوں بیٹیاں ماشاء اللہ قبول صورت اور سگھڑ تھیں۔

فرید احمد کے سامنے اگر کوئی مسئلہ تھا تو وہ تھا دونوں لڑکیوں کی شادی کا۔ رشتہ داروں میں لڑکے تھے لیکن ان لوگوں کے مطالبات کو پورا کرنا فرید احمد کے بس کی بات نہ تھی۔ غیروں میں رشتہ کرنے میں بھی وہی مطالبات کی حوصلہ شکن فہرست ہوتی اور دل کی آرزو دل ہی میں رہ جاتی۔ وہ کہتے۔ ''کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ بجائے صورت، سیرت اور خاندان کے جہیز کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ایسی لعنت ہے کہ اکثر لوگوں کی لڑکیاں یوں ہی عمر گزار دیں گی اور ان کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکیں گے۔''

ان حالات کو دیکھتے ہوئے فرید صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد روپیہ ملتے ہی اپنی بچیوں کی شادی کا انتظام کریں گے۔ اپنی بیگم کو بھی انہوں نے تسلی دے کر خاموش کر دیا۔ دو سال کی بات تھی۔ وقت تو تیزی سے گزر جاتا ہے۔ فرید صاحب مجبور تھے۔ ان کے پاس کوئی متبادل راہ بھی تو نہیں تھی۔

فرید احمد خیر سے ریٹائر ہو گئے۔ انہیں یکمشت تقریباً پانچ لاکھ روپے ملے۔ انہوں نے رقم کو بنک میں رکھ دیا اور رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ جلد ہی دونوں صاحبزادیوں کے رشتے

طے ہو گئے۔ تاریخ مقرر کر دی گئی اور تیاری شروع ہو گئی۔ بیگم فرید نے کہا۔

''کم از کم دو لاکھ روپے تو بنک سے نکال کر لائیں تا کہ دونوں کے جہیز کی تیاری کی جا سکے۔ ضرورت پڑنے پر مزید رقم آئندہ نکالا جا سکے گا۔''

بات معقول تھی۔ فرید احمد بنک گئے اور دو لاکھ روپے بنک سے لے کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ جیسے ہی وہ گھر کے پاس ٹیکسی سے اترے، ویسے ہی موٹر سائیکل پر سوار تین نوجوانوں نے انہیں گھیر لیا اور پستول دکھا کر رقم چھین کر لے گئے۔ وہ روتے گھبراتے گھر کے اندر چلے گئے اور گھر والوں کو پوری روداد سنائی۔ اس حادثے کا پورے گھر پر اثر ہوا۔ ایک عجیب غم زدہ ماحول پیدا ہو گیا۔ شادی سر پر اور ظالموں نے انہیں لوٹ کر بے بس کر دیا۔

فرید صاحب اپنے محکمے میں بڑے ایماندار تصور کئے جاتے تھے۔ وہ ایک زمانے تک یونین کے سکریٹری رہے اور ملازمین کی بھلائی کے لئے بہت کام کئے۔ وہ اپنے ساتھیوں اور دوسرے کام کرنے والوں میں بہت مقبول تھے۔ اس حادثے کی خبر جب یونین والوں کو ملی تو وہ دلجوئی کے لئے آئے اور کہا۔

''آپ کی بیٹی ہم سب کی بیٹی ہے۔ آپ رقم کی فکر نہ کریں۔ ہم سب مل کر اپنی بیٹیوں کا بوجھ اٹھائیں گے۔''

چنانچہ ان لوگوں نے اشتراک باہمی کے اصول پر دو لاکھ کی رقم اکٹھی کر لی اور اس طرح دونوں بچیوں کی شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔

فرید احمد کا ضمیر کسی طرح مطمئن نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے لٹیرے پکڑے جائیں اور ان لوگوں کو خاطر خواہ سزا ملے تا کہ وہ آئندہ کسی کو نہ لوٹیں۔ وہ بار بار پولیس کے پاس جاتے اور اپنے ایف آئی آر کا حوالہ دے کر پوچھتے کہ معاملہ کہاں تک پہنچا۔ پولیس کہتی۔

''ہم لوگ تلاش میں ہیں۔ اگر مجرم مل گئے تو کچھ ہو سکے گا۔ ویسے روپے کی کوئی شناخت نہیں ہوتی ہے اس لئے آپ کی رقم ملنے کی امید معدوم ہے۔''

فرید صاحب مجرم کو پکڑوانے میں بہت سنجیدہ تھے۔ انہوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ اس سلسلے میں انہیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ وہ بازار، بنک، ڈاکخانہ مختلف دفاتر کے چکر روزانہ لگاتے کہ شاید ان تینوں میں کوئی نظر آ جائے۔ وقت گزرتا گیا اور تلاش کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر ایک دن اپنے بنک میں ضروری کام سے گئے ہوئے تھے کہ اچانک ان کی نظر ان تینوں میں سے ایک پر پڑی۔ وہ بنک کے اندر ایک ملازم سے محوِ گفتگو تھا۔ فرید صاحب نے اسے غور سے دیکھا اور اپنی تسلی کرلی کہ ان کا قیاس درست ہے۔ اب رہا اس کی گرفتاری کا مسئلہ۔ اگر پولیس کو براہ راست کہا جائے اور پولیس بھی ملوث ہو تو کام بگڑ جائے گا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر خیال آیا کہ عبد الصمد وکیل جو بڑے وکیل بھی تھے اور فرید صاحب کے رشتہ دار بھی، ان سے مدد لی جائے۔

فرید صاحب وکیل صاحب کے پاس گئے اور ان سے پوری روداد کہی۔ وکیل صاحب کی ملاقات مقامی ایس پی سے تھی۔ ایس پی سے رابطہ کرنے کے بعد وکیل صاحب فرید احمد کو لے کر ان کے پاس گئے اور تفصیل بتائی۔

ایس پی نے کہا۔ ''میں دو بندے سادہ کپڑوں میں ملبوس فرید صاحب کے ساتھ کردوں گا۔ وہ لوگ اس بنک کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ اگر وہ شخص وہاں آیا تو فرید صاحب اس کی نشاندہی کردیں گے۔ بقیہ کام میرے آدمی خود کرلیں گے۔''

حسب پروگرام فریدؔ احمد اور وہ دونوں سرکاری عملے بنک کی نگرانی کرنے لگے۔ اتفاق سے تیسرے ہی دن فرید صاحب نے اس آدمی کو موٹر سائیکل سے اتر کر بنک کے اندر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے فوراً جا کر ان نگرانوں کو اطلاع دی اور اشارے سے شناخت کرادی۔ نتیجتاً وہ گرفتار ہوگیا۔ اس کے پاس سے ایک پستول بھی برآمد ہوا۔

پولیس نے اپنے طور پر چھان بین شروع کردی۔ اس کے علاوہ دو اور افراد کی مختلف مقامات سے گرفتاری ہوئی، ان کا سرغنہ بھی گرفتار ہوا جو ایک عرصے سے روپوش تھا۔ وہ پہلے پولیس کے محکمے میں ملازم تھا اور کئی وارداتوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے وہ پولیس کو مطلوب تھا۔ حکومت نے اسے اشتہاری ملزم قرار دے کر دس لاکھ روپے کے انعام کا اعلان بھی کیا تھا۔

مقدمہ چلا اور سب کو خاطر خواہ سزا بھی ہوگئی۔ انعام کی رقم میں سے پانچ لاکھ روپے پولیس کے اہل کاروں میں تقسیم کیے گئے۔ پانچ لاکھ روپے فرید احمد کو بطور انعام دیئے گئے کہ ان کی نشاندہی پر مجرم پکڑے گئے تھے۔ فرید احمد نے انعام ملنے پر کہا۔ ''مولا تیرے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

☆☆☆

سبز قدم

عرفان حیدر کا بیٹا فرقان حیدر بی۔ کام پاس کرنے کے بعد جب ایک بینک میں ملازم ہوا تو والدین کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ کئی رشتے آئے لیکن عرفان اور ان کی بیگم نے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو یتیم تھی اور اپنے بھائی کی کفالت میں تھی۔ یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ بہو کا نہ کوئی میکہ ہوگا، نہ آنا جانا ہوگا۔ سخت سست سن کر بھی وہ کہیں نہیں جائے گی۔

حسب پروگرام شادی ہوگئی۔ شادی کے دو ہفتہ کے بعد عرفان حیدر کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ کچھ دن گھر پر غم کے بادل چھائے رہے اور پھر مطلع صاف ہوگیا۔ ہر چیز معمول پر آگئی۔ بدقسمتی تنہا نہیں آتی۔ چند ماہ بعد فرقان حیدر کی بھی ایک حادثے میں موت ہوگئی۔ اتنے بڑے سانحے کا اثر گھر کے ہر فرد پر پڑا لیکن جو نامعقول بات ہوئی وہ فرقان حیدر کی ماں کا نور جہاں کو سبز قدم اور منحوس کے القاب سے نوازنا تھا۔

''پیدا ہوتے ہی ماں باپ کو کھا گئی۔ اس گھر میں قدم رکھا تو سسر کو چٹ کر گئی اور اب شوہر کو ہضم کر گئی۔ تیرا سایہ منحوس ہے، تو جلد اس گھر کو چھوڑ کر چلی جا ورنہ اور کس کس کو کھائے گی ڈائن کہیں کی۔''

نور جہاں کو جتنا صدمہ سہاگ لٹنے کا تھا اس سے کہیں زیادہ ساس کی زہریلی باتوں کا تھا۔ ساس اور فرقان حیدر کے بھائی نے نور جہاں سے کہا۔

''اب تمہارا یہاں کیا رکھا ہے۔ فوراً اس گھر سے نکل جاؤ۔ اگر کچھ دن اور رہ گئی تو نہ معلوم تیری نحوست کی لپیٹ میں کون کون آجائے گا۔''

''میں کہاں جاؤں میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ پھر یہ کہ میں ابھی عدت میں ہوں، اس گھر سے کیسے جاسکتی ہوں۔'' نور جہاں کہا کرتی۔

دوسرے رشتہ داروں نے بھی ان لوگوں سے کہا کہ عدت پوری کئے بغیر وہ کہاں جاسکتی ہے۔ یوں فوراً نکل جانے کا تقاضہ تو کم ہوگیا لیکن نور جہاں کو ایک کمرے میں محصور کر دیا گیا تاکہ اس کا سایہ کسی پر نہ پڑ سکے اور کوئی نیا حادثہ رونما نہ ہو۔

نور جہاں نے بھائی کو جو تعزیت کے لئے آیا ہوا تھا، ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ بھائی نے کہا کہ عدت ختم ہوتے ہی وہ اسے آکر لے جائے گا۔

حسب وعدہ عدت ختم ہوتے ہی نور جہاں کا بھائی آیا اور اسے لے کر چلا گیا۔ جاتے وقت نور جہاں کے کپڑے اور زیور سسرال والوں نے روک لئے اور وہ صرف ایک جوڑے کپڑے میں ہی بھائی کے گھر پہنچی۔ وہاں اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ اسے اس کشیدہ ماحول سے نجات مل گئی۔

کچھ ہی دنوں بعد نور جہاں کے بھائی کا بیٹا سائیکل چلاتے ہوئے گر گیا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب تو اس کی بھاوج نور جہاں کے پیچھے پڑ گئی۔

''نور جہاں تو واقعی منحوس ہے۔ سسرال والوں نے تجھ پر صحیح الزام لگایا ہے۔ تیرے آتے ہی میرے بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔۔ اب پتہ نہیں اور کیا کیا دیکھنے کو ملے گا۔''

اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''تم نور جہاں کو کہیں اور لے جاؤ۔ میں اسے اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔''

''نور جہاں میری بہن ہے، وہ بیوہ ہوگئی ہے، اس کا اس دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں ہے، میں اسے اپنے گھر سے کیسے نکال دوں۔'' نور جہاں کے بھائی معظم نے اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

اس مسئلے پر میاں بیوی میں تقریباً روزانہ نوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ نور جہاں کو یہ ماحول اچھا نہیں لگا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات خراب نہ

ہو جائیں۔ اسے خیال آیا کہ وہ میٹرک پاس ہے، کیوں نہ کہیں ملازمت کر کے ان لوگوں سے الگ ہو کر زندگی گزارے۔

نور جہاں اپنے منصوبے پر غور و فکر کرتی رہتی کہ ایک دن اخبار میں ایک اشتہار پر اس کی نظر پڑی جس میں ایک پرائمری اسکول کے لئے میٹرک پاس استانی کی ضرورت تھی۔ نور جہاں نے درخواست بھیج دی۔ ایک ہفتہ کے بعد محکمہ تعلیمات سے طلبی ہوئی۔ نور جہاں بھائی کے ساتھ گئی۔ نور جہاں سے کچھ پوچھ گچھ کے بعد محکمہ تعلیم نے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ نور جہاں نے بھائی سے اجازت لے کر ملازمت شروع کر دی۔ اسکول کا ماحول اچھا تھا۔ نور جہاں وہاں سب سے بہت جلد گھل مل گئی۔ نور جہاں نے بھائی سے کہا کہ وہ اب ان لوگوں پر بوجھ نہیں بنے گی۔ اس کی بھاوج نے کہا کہ نور جہاں کے کھانے پینے کا بوجھ تو کوئی بوجھ نہیں، ڈر تو اس کے سائے کا ہے جس سے لوگ پناہ مانگتے ہیں۔

نور جہاں سخت پریشان تھی کہ کیا کرے۔ وہ عورت ذات ہے، تنہا کسی کرایہ کے مکان میں رہ نہیں سکتی۔ وہ اسی الجھن میں تھی کہ ایک خاتون اسکول آئیں اور ہیڈ مسٹریس سے ملتجی ہوئیں کہ انہیں ایک اچھی سی معلمہ کی ضرورت ہے جو ان کی بچی کو پڑھا دیا کرے۔ چونکہ معاوضہ معقول دینے پر تیار نہ تھیں اس لئے اسکول کی معلمہ نے انکار کر دیا۔ لیکن نور جہاں نے پیشکش کر دی کہ وہ کوئی معاوضہ نہیں لے گی، صرف رہائش کے بدلے ان کی بچی کو پڑھا دیا کرے گی۔ خاتون نے یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ ان کا مکان کشادہ تھا، کئی کمرے استعمال میں نہ رہتے تھے۔

نور جہاں اس خاتون کے گھر آ گئی۔ بھائی نے روکنا چاہا لیکن نور جہاں کے اصرار اور اپنی بیگم کی چخ چخ کے سبب اسے اجازت دینا ہی پڑی۔ نور جہاں نے دیکھا کہ پرائمری اسکول میں تنخواہ بہت کم ہے اس لئے اسے اپنی تعلیمی استعداد بڑھانی چاہئے تا کہ بہتر ملازمت مل سکے۔ چنانچہ اس نے انٹر اور پھر بی۔ اے بھی پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کر لیا۔ پھر اس نے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی اور گورنمنٹ ہائی اسکول میں ملازم ہو گئی۔ نور جہاں کا حوصلہ اور بڑھا اور اس نے ایم۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کر کے ایک گرلس کالج میں لیکچرار ہو گئی۔

ان مراحل کو طے کرنے کے بعد نور جہاں کو اپنی آئندہ زندگی کی فکر محسوس ہوئی۔ اسی خیال میں تھی کہ اس کی اسلم چشتی سے ملاقات ہوگئی۔ اسلم چشتی ایک مقامی کالج میں پروفیسر تھا۔ دوران گفتگو پتہ چلا کہ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن اس کی بیوی کا شادی کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال ہوگیا تھا۔ چند رسمی ملاقاتوں کے بعد دونوں کے تعلقات گہرے ہوگئے اور دونوں آپس میں شادی پر آمادہ ہوگئے۔

نور جہاں نے بھائی سے مشورہ کیا اور رسمی گفت وشنید کے بعد شادی کی رسم ادا ہوگئی۔ شادی کے دو سال بعد اللہ نے ان لوگوں کو ایک چاند سا بیٹا عطا کیا۔ چونکہ دونوں ملازم تھے اس لئے بچے کی دیکھ بھال کے لئے ایک آیا کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے اشتہار دیا۔ کئی عورتیں ملنے آئیں۔ نور جہاں ایک ایک کو بلاتی، ان سے باتیں کرتی لیکن مطمئن نہ ہو سکی۔ عجیب اتفاق کہ انہیں آنے والوں میں ایک وہ بھی تھی جو اس کے پہلے شوہر کی ماں تھی۔ نور جہاں نے دیکھتے ہی کہا۔ ''اماں آپ؟''

''ہاں، قسمت کی ماری میں ہی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ اس حال کو کیسے پہنچیں؟'' نور جہاں نے پوچھا۔

''دو سال ہوئے کہ بڑے بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد بڑی بہو نے گھر پر قبضہ کر لیا اور مجھے مار پیٹ کر بھگا دیا۔ بس اس وقت سے ماری ماری پھر رہی ہوں۔ لوگوں کی خدمت کر کے جی رہی ہوں۔ چونکہ اب زیادہ محنت نہیں کر سکتی اس لئے آیا کی ملازمت کا سن کر یہاں آئی ہوں۔''

''اماں میں تو سبز قدم ہوں۔ اگر میرا سایہ آپ پر پڑ گیا تو!'' نور جہاں نے تلخی سے کہا۔

''بیٹی مجھے معاف کر دو۔ میری سمجھ میں اب آیا کہ سبز قدم کوئی انسان نہیں ہوتا۔ یہ سب تو قدرت کا کھیل ہے۔ ہر شخص اپنی قسمت لے کر آتا ہے۔ دیکھو تم ماشاء اللہ آسائش کی کرسی پر براجمان ہو اور میں نحوست کی دہلیز پر۔ تمہیں بتاؤ کہ سبز قدم کون ہے؟''

☆☆☆

بوجھ

عامر نے جب بی۔کام اچھے نمبروں سے پاس کیا تو اس نے اپنے والد سے کہا۔

''ابو، میں سی۔اے کرنا چاہتا ہوں۔''

والد نے خوش ہو کر کہا۔''اچھی بات ہے، تم کسی اچھے ادارے میں Articleship حاصل کرلو۔''

''نہیں ابو، میں لندن جا کر سی۔اے کرنا چاہتا ہوں۔'' عامر نے کہا۔

''یہ تو اور اچھی بات ہے۔تیاری کرو۔'' اس کے والد عارف صاحب نے کہا۔

عامر نے اپنے والد کے مشورے سے پروگرام بنالیا۔ اسے تعلیمی ویزا مل گیا اور وہ لندن روانہ ہو گیا۔

حسب انتظام وہ لندن میں اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا۔ وہاں کے بڑے بڑے تجارتی اور اکاؤنٹنگ فرم سے ملازمت کے لئے رابطہ کیا۔تقریباً تین ماہ کی کوشش کے بعد اسے حسب خواہ ملازمت مل گئی۔ عامر اپنے دوست کے گھر سے ایک کرائے کے کمرے میں منتقل ہو گیا۔دوست اور اس کی بیگم نے اسے مزید ساتھ رہنے کی پیش کش کی لیکن عامر نے کہا۔

''آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے، اب میں آپ لوگوں پر مزید بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔''

عامر نے دن رات محنت کر کے ایک سال ہی میں سی۔اے کا پارٹ ون کرلیا اور اپنی

کوشش جاری رکھی اور مزید تین سال میں پارٹ ٹو بھی مکمل کر لیا۔ نتیجہ نکلتے ہی مختلف تجارتی اداروں سے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ عامر نے کافی غور و خوض کے بعد ایک اچھی سی ملازمت حاصل کر لی۔ عامر نے اپنے سی۔ اے کر لینے کی اور اپنی ملازمت کی اطلاع اپنے والدین کو دی۔ والدین بہت خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ عارف صاحب نے عامر کو لکھا:

''اب تم جلد پاکستان آجاؤ۔ ہم لوگ تمہاری شادی کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔''

عامر نے جواب میں لکھا:

''امروز فردا میں پاکستان آنا مشکل ہے۔ نئی ملازمت ہے، سال دو سال بعد ہی کچھ ہو سکے گا۔''

کچھ عرصہ کے بعد عارف صاحب کو دل کا دورہ پڑا اور ان کی حالت تشویشناک ہو گئی۔ عامر کو اطلاع دی گئی۔ وہ چند دنوں کے لئے پاکستان آیا اور والد کے علاج و خدمت میں لگا رہا۔ عارف صاحب کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ وہ عامر کو سوگوار چھوڑ کر ابدی نیند سو گئے۔ عامر کچھ دن مزید رہ کر لندن چلا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد عامر کی والدہ نے عامر کو لکھا:

''تم پاکستان چھٹی لے کر آجاؤ۔ میری زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں تمہاری شادی میری زندگی میں انجام پا جائے۔ اگر کوئی مجبوری ہے تو تم لندن ہی میں کسی معقول لڑکی سے شادی کر لو۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ شادی کا ایک وقت ہوتا ہے، تم اس حد کو پار کر چکے ہو۔ مزید تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔''

عامر کا جواب آیا:

''آپ بھائی جان اور بھابی کو لے کر ڈاکٹر فیروز کے گھر جائیں۔ ان کا پتہ اور ٹیلی فون

نمبر لکھ رہا ہوں۔ پہلے ٹیلی فون پر رابطہ کرلیں۔ کچھ دنوں پہلے ڈاکٹر فیروز کی پوری فیملی لندن آئی تھی۔ مجھ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی ایک بیٹی ہے نیلوفر۔ ان لوگوں نے مجھ سے اشارے اشارے میں عندیہ لینا چاہا تھا لیکن میں نے اس کی ذمہ داری آپ لوگوں پر ڈال دی ہے۔ اگر آپ لوگوں کو وہ گھرانہ اور لڑکی پسند آئے تو ساری باتیں طے کر کے مجھے مطلع کر دیں، میں شادی کے کے لئے آجاؤں گا۔"

عامر کی والدہ نے ڈاکٹر فیروز کے گھر سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور طے ہوا کہ آئندہ اتوار کی شام عامر کی والدہ اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے ساتھ ڈاکٹر فیروز کے گھر پہنچیں گی۔

حسب پروگرام دونوں گھرانے کے لوگوں میں باتیں ہوئیں۔ عامر کی والدہ نے نیلوفر کا رشتہ اپنے بیٹے کے لئے مانگا۔ بیگم فیروز نے کہا۔

"نیلوفر آپ کی بیٹی ہے۔ ہم لوگوں کو یہ رشتہ منظور ہے۔ آپ جب چاہیں باضابطہ ساری باتیں طے کرلیں۔"

"میں عامر سے بات کر کے حتمی جواب دوں گی۔" عامر کی والدہ نے کہا۔

عامر کی والدہ نے بیٹے کو مطلع کیا کہ وہ لڑکی دیکھ آئی ہیں۔ لڑکی انہیں پسند ہے لیکن وہ لوگ ذرا مغرب زدہ ہیں۔ ان لوگوں کی طرزِ رہائش اور ہم لوگوں کی طرزِ رہائش میں بہت فرق ہے۔

عامر نے جواب میں لکھا:

"آپ پاکستان کی رہائش سے کیوں موازنہ کر رہی ہیں۔ یہاں میری طرزِ رہائش بھی ویسی ہی ہے۔ ہم کسی طرح ان لوگوں سے کم تر نہیں۔ آپ تاریخ طے کریں اور مجھے اطلاع کر دیں، میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ویسے میرے خیال میں فروری کی کوئی تاریخ مناسب رہے گی۔"

طرفین کی رضامندی سے ۱۷ فروری کی تاریخ مقرر ہوئی اور عامر کو اطلاع دے دی

گئی۔ عامر آئے اور مقررہ تاریخ پر شادی بڑی دھوم دھام سے ایک پنج ستارہ ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ تیسرے دن ولیمہ بھی اسی کرّ وفر سے ہوٹل میں ہوا۔ دو ہفتے کے بعد عامر لندن چلا گیا اور تقریباً دو ماہ بعد نیلوفر بھی لندن روانہ ہوگئی۔

عامر اور بیگم عامر دونوں لندن میں خوش وخرم زندگی بسر کررہے تھے۔ تقریباً دو سال بعد نیلوفر امید سے ہوئی اور اللہ نے ان لوگوں کو ایک خوبصورت سی بیٹی عطا کی۔ پاکستان جب خبر پہنچی تو عامر کی والدہ اور نیلوفر کے والدین بہت خوش ہوئے۔ عامر کی والدہ کے بے حد اصرار پر عامر پاکستان آیا۔ دادی نے بڑی دھوم دھام سے پوتی کی رسمِ عقیقہ ادا کی۔ دعوت ہوئی، عزیز واقارب شریک ہوئے۔ گھر میں خوب رونق ہوئی۔ دو ہفتے رہ کر عامر اپنی بیگم اور اپنی بیٹی غزالہ کے ساتھ لندن واپس چلا گیا۔

کچھ دنوں تک زندگی کا کارواں بہ حسن وخوبی رواں دواں رہا کہ عامر کی والدہ چند دن بیمار رہ کر مالکِ حقیقی سے جاملیں۔ عامر کو والدہ کی موت کا بہت صدمہ ہوا اور کئی دن تک وہ کھویا کھویا رہا اور پاکستان آنے کی تیاری کرنے لگا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عامر اچانک ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ اس کے اعصاب بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ لکھنے پڑھنے اور دیگر جسمانی مشقت کے قابل نہ رہا۔ وہ جسمانی طور پر معذور ہوگیا۔ ملازمت چھوڑنی پڑی اور گزارہ الاؤنس پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگیا۔

اس حادثے کے بعد بیگم عامر کے رویے میں رفتہ رفتہ فرق آنے لگا۔ عامر نے بھی بیگم میں نمایاں فرق محسوس کیا۔ عامر سخت حیران تھا کہ اس وقت اسے ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن معاملہ کچھ الٹا ہی نظر آرہا تھا۔ عامر نے بیگم سے استفسار کیا کہ وہ اتنی تلخ اور بیزار کیوں نظر آتی ہے۔ بیگم عامر نے کہا۔

''خیرات پر پلنے سے بیزاری نہ ہوگی تو کیا خوشی ہوگی؟''

عامر نے پوچھا۔ ''خیرات کیسی؟''

''یہ جو ہم لوگ گزارہ الاؤنس پر زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ خیرات نہیں تو اور کیا ہے؟''

''یہ خیرات نہیں ہے۔'' عامر نے کہا۔ ''یہ حکومت کی طرف سے وظیفہ ہے۔''

''نہیں چاہئے ہمیں یہ وظیفہ۔'' بیگم نے تلخی سے کہا۔

''مجبوری ہے۔ کیا کیا جائے۔''

''آپ گھر فروخت کر دیں اور پاکستان واپس چلیں۔ ہم لوگ اسی رقم سے کوئی کاروبار کریں گے اور پھر میرے والدین ہیں۔ وہ بھی ہم لوگوں کی معاونت کریں گے۔'' بیگم عامر نے کہا۔

عامر سوچ میں پڑ گیا۔ بیگم کا اصرار بڑھتا گیا اور بالآخر بیگم کی بات مان کر عامر نے مکان بیچ دیا اور جو پسماندہ جمع پونجی تھی، سب کچھ لے کر پاکستان آ گیا۔

بیگم کے اصرار پر اس نے سسرال میں ہی قیام کیا۔ عامر کو چند ہی دنوں میں احساس ہو گیا کہ لوگوں میں وہ گرم جوشی نہیں ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ پہلے وہ لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا اور اب وہ لوگوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا ہے۔

نیلوفر نے عامر سے کہا۔ '' آپ کم از کم پندرہ لاکھ روپے دے دیجئے۔ میں اس رقم کو اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ کاروبار میں لگاؤں گی۔ مجھے امید ہے اس سے ہم لوگوں کو پندرہ سولہ ہزار روپے ماہانہ ملا کرے گا جو ہمارے گزارے کے لئے کافی ہوگا۔''

عامر نے دوسرے روز ہی پندرہ لاکھ کا چیک بیگم کے حوالے کر دیا۔

''بیگم اب ہم لوگوں کو اپنے مکان میں منتقل ہو جانا چاہئے۔'' عامر نے ایک دن اپنی بیگم سے کہا۔

بیگم چونک اٹھیں۔ ''اپنا مکان؟ اپنا کون سا مکان؟''

''میرا آبائی مکان۔'' عامر نے کہا۔

'ابھی مناسب نہیں ہے۔'' بیگم نے کہا۔ ذرا آمدنی ہونے لگے تب ٹھیک رہے گا۔''

بیگم فیروزان لوگوں کی پلاننگ میں بظاہر کوئی دخل نہیں دیتی تھیں۔لیکن ایک روز انہوں نے نیلوفر کو پاس بٹھایا اور رازدارانہ انداز میں کہا۔

''نیلو، تم ابھی ماشاء اللہ جوان ہو، زندگی کی راہ طویل ہے۔تم اس معذور شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزارو گی۔ میری مانو تو اس آدمی سے چھٹکارا حاصل کرلو۔تم اس بوجھ کو کب تک ڈھوتی پھرو گی۔ اگر تم عامر سے طلاق لے لو تو میں تمہاری شادی عدیل کے ساتھ کر دوں گی۔عدیل اچھی ملازمت کر رہا ہے۔اللہ کا دیا سب کچھ اس کے پاس ہے۔ پھر وہ میرے بھائی کا لڑکا ہے۔ میں بھائی جان اور عدیل سے بات کر چکی ہوں۔ وہ لوگ آمادہ ہیں۔''

''امی وہ میرا شوہر ہے۔حالات نے اسے اپاہج کر دیا ہے۔میں نے اس کے ساتھ بہت اچھے دن گزارے ہیں۔ میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔اس کے دل پر کیا گزرے گی۔اس کو اس وقت سہارے اور دلجوئی کی ضرورت ہے۔''

''بیٹی ہر شخص کو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا حق ہے۔ہم لوگوں کا کیا ہے، آج مرے کل دوسرا دن۔تمہیں طویل راہ طے کرنی ہے۔ کچھ دنوں بعد تم مالی طور پر مفلوج ہو جاؤ گی اور سہارا ڈھونڈتی پھرو گی، کوئی بیٹا بھی نہیں جو سہارا بن سکے۔''

ماں کی بات سن کر نیلوفر گہری سوچ میں پڑ گئی اور کئی دن کے تجزیہ کے بعد وہ ماں کی باتوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

نیلوفر نے اپنی ماں کے مشورہ کے مطابق عامر سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ عامر سن کر حیران رہ گیا۔

''بیگم، یہ آپ کو کیا ہو گیا۔ اتنا بڑا فیصلہ آپ نے یکا یک کیسے کر لیا؟''

عامر نے بیگم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔اس کا اصرار بڑھتا گیا اور وہ دھمکیوں پر بھی آمادہ ہو گئی۔

''اگر تم طلاق نہیں دو گے تو میں عدالت سے رجوع کروں گی اور خلع طلب کروں گی۔ میں تم جیسے معذور انسان کے ساتھ زندگی کی طویل راہ پر زیادہ دور تک نہیں چل سکتی۔''

عامر کے پاس اب طلاق کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نہ تھا۔

''میرے پندرہ لاکھ روپے؟'' عامر نے پوچھا۔

''تمہاری بیٹی میرے ساتھ ہے۔ یہ روپے اسی کے نام رہیں گے اور اسی کے کام آئیں گے۔''

عامر نے زچ ہو کر طلاق نامے پر دستخط کئے اور اپنے بھائی کے پاس آ گیا۔ بھائی نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''تمہیں سسرال میں قیام کرنے کی بجائے پہلے دن ہی یہاں آ جانا چاہئے تھا۔''

نیلوفر کی عدت کے بعد جب عدیل سے شادی کی بات چھیڑی گئی تو تو عدیل نے کہا کہ وہ حسب وعدہ شادی کے لئے تیار ہے لیکن وہ عامر کی بیٹی کو قبول نہیں کریگا۔

''ٹھیک ہے، اس کی پرورش ہم کریں گے۔'' بیگم فیروز نے کہا۔

''امی، آپ لوگوں کا کیا ٹھکانا، آپ لوگوں کو اگر کچھ ہو گیا تو میری بیٹی تو لاوارث ہو جائے گی۔ میں اپنی بیٹی کو کسی قیمت پر خود سے جدا نہیں کروں گی۔'' نیلوفر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

بیگم فیروز کی بنائی ساری اسکیم ناکام ہو رہی تھی۔ نیلوفر کو بھی پچھتاوا ہوا۔ اس نے شوہر کو بھی چھوڑ دیا اور کسی دوسرے سہارے سے بھی محروم رہی۔

ایک دن عامر اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ اسے اپنی بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کے بھائی سے کہہ رہی تھی۔

''عامر کب تک ہم پر بوجھ بنا رہے گا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی تدبیر کریں۔''

''وہ میرا بھائی ہے۔ قسمت کے ہاتھوں معذور ہو گیا ہے۔ میں اس سے کیسے کہوں کہ وہ چلا جائے۔ جس مکان میں ہم رہتے ہیں اس میں اس کا بھی حصہ ہے۔'' عامر کو بھائی کی آواز سنائی دی۔

''تو دے دیں اس کا حصہ۔ میں اب اس اپاہج کو برداشت نہیں کر سکتی، اپنے بچوں کی ذمہ داری تو مشکل سے اٹھائی جاتی ہے، اسے کہاں ڈھوتے پھریں۔''

''بیگم خاموش ہو جاؤ۔ عامر نے اگر سن لیا تو اسے بہت تکلیف ہوگی۔ آئندہ میں اس قسم کی باتیں سننا نہیں چاہتا۔''

عامر کے لئے گھر والوں کا رویہ خاصا پریشان کن تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کی وجہ سے کہیں بھائی کی زندگی نہ تلخ ہو جائے۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ایسے ماحول میں جہاں ہر شخص بیزار نظر آتا ہے وہ اپنی زندگی کے دن کیسے گزارے گا۔ قبل اس کے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے وہ اس ماحول سے دور چلا جائے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لندن واپس چلا جائے گا۔ اس کی شہریت قائم ہے۔

عامر نے بھائی سے کہا۔ ''میں لندن واپس جا رہا ہوں۔ مجھے اس ڈاکٹر سے مشورہ کرنا ہے جس نے میرا علاج کیا تھا۔ شاید کوئی صورت بہتری کی نکل آئے۔''

''اگر یہ بات ہے تو ضرور جاؤ لیکن علاج کے بعد واپس آ جانا، مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔''

عامر نے لندن پہنچ کر اپنا وظیفہ دوبارہ جاری کرایا اور ایک کمرہ کرائے پر لے کر گزر بسر کرنے لگا۔ اس نے بھائی کو لکھا۔

''میں نے لندن آ کر آپ لوگوں کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں اب پاکستان نہیں آؤں گا۔ برطانیہ ایک فلاحی مملکت ہے۔ یہاں کوئی معذور اپاہج بھوکوں نہیں مرتا۔ یہاں کوئی کسی پر بوجھ نہیں ہوتا۔''

مکافاتِ عمل

ممتاز احمد اپنے گاؤں میں ایک زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد آبائی جائداد کے واحد مالک تھے۔ ان کی شادی اپنے ماموں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے اور نہایت خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ دونوں کو اولاد کی خواہش تھی۔ شادی کے چار سال بعد بیگم غزالہ امید سے ہوئیں۔ ممتاز صاحب کو جب معلوم ہوا تو لوگوں میں مٹھائی تقسیم کرائی۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور قدرت کرتی کچھ اور ہے۔ جب بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو ممتاز صاحب بیگم کو لے کر شہر آ گئے۔ ایک بڑے اسپتال میں داخل کرایا۔ دو دن بعد ولادت کے آثار شروع ہوئے اور بیگم درد سے نڈھال ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے اجازت طلب کی آپریشن کے ذریعہ ولادت کرادی جائے لیکن ممتاز احمد اور ان کی بیگم آمادہ نہ ہوئیں اور اسی کرب کے عالم میں چار دن گزر گئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کر کے بتایا کہ Breach ہے اور بغیر آپریشن ولادت ممکن نہیں۔ مجبور ہو کر ممتاز احمد نے دوسرے دن اجازت دے دی لیکن تاخیر کے سبب بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی موت کا شکار ہو گیا اور بیگم کے جسم میں زہریلا مادہ پھیل گیا۔ آپریشن سے مردہ بچہ کو نکال لیا گیا لیکن بیگم غزالہ کی طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ ڈاکٹروں نے جان بچانے کی بہت کوشش کی لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دس دن حیات و موت کی کشمکش میں رہ کر بیگم غزالہ ممتاز کا انتقال ہو گیا۔

بیگم کی موت کا ممتاز احمد پر بہت گہرا اثر پڑا۔ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ کسی کام میں ان کا دل نہ لگتا۔ زمینداری کے معاملات اور شہر کے کاروبار سب سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔ ان کے رشتہ دار اور گاؤں کے لوگ ممتاز احمد کی حالت سے بہت پریشان تھے۔ جس سے جو بن پڑتا وہ تشفی وتسلی دینے کی کوشش کرتا لیکن ممتاز احمد پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

وقت خود بہت بڑا مرہم ہے۔ وقت گزرتا گیا اور چند ماہ میں ممتاز احمد آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگے اور ان میں جینے کا حوصلہ بیدار ہوگیا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ماشاء اللہ آپ جوان ہیں، خوبرو ہیں، اہلِ ثروت ہیں، آپ شادی کرلیں۔ کئی رشتے بھی آئے لیکن ممتاز احمد نے اپنی رضامندی نہیں دی۔ لوگوں کے بار بار اصرار پر ممتاز احمد نے کہا۔

''اول تو میرا شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے اور ارادہ ہوا بھی تو میں اپنے رشتہ داروں یا گاؤں کے گھرانے میں نہیں کروں گا۔ رشتہ داروں میں شادی چونکہ راس نہیں آئی اس لئے کسی غیر جگہ شادی کروں گا۔''

ممتاز صاحب نے شہر میں ایک رہائش گاہ کرائے پر لے رکھی تھی۔ انہیں اکثر زمین کے مقدمے اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر جانا ہوتا تھا۔ اپنے ایک کرم فرما کرامت علی کی وساطت سے یہ رہائش گاہ حکیم نصیر الدین کی عمارت میں لے رکھی تھی۔ حکیم صاحب کے مکان کی زمینی منزل میں ان کا مطب وعطار خانہ اور دواسازی وغیرہ کے سامان تھے۔ اوپر کی منزل میں دو حصے تھے۔ ایک میں حکیم صاحب رہائش پذیر تھے اور دوسرا حصہ ممتاز صاحب کو کرایہ پر دے رکھا تھا مگر اس کی دیکھ بھال، صفائی ستھرائی سب حکیم صاحب کے ذمہ تھے۔ جب ممتاز صاحب رہتے تو ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی حکیم صاحب کی ذمہ داری ہوتی۔ ان ساری خدمات کا ممتاز صاحب معقول معاوضہ ادا کرتے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری تھا۔ حکیم صاحب کی بیگم کا انتقال ہوچکا تھا اور ان کا مختصر سا کنبہ ان کی بیٹی لالہ رخ اور ماما مہتاب پر مشتمل تھا۔

ایک دن ممتاز صاحب اچانک اپنی رہائش گاہ پہنچے تو ایک خاتون کو بستر کی چادر بدلتے ہوئے دیکھا۔ خاتون نے آہٹ پاتے ہی پلٹ کر دیکھا اور کمرے سے تیزی کے ساتھ نکل گئی۔ دروازے کی اوٹ سے آواز آئی۔

''مہتاب گھر پر نہیں ہے۔ ضروری کام سے باہر گئی ہوئی ہے اور آپ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا اس لئے میں ہی آپ کے بستر کی چادر بدلنے گئی تھی۔''

ممتاز صاحب سمجھ گئے کہ یہ لالہ رخ ہے۔ انہوں نے آہستہ سے شکریہ ادا کیا۔

ممتاز صاحب ایک ہی جھلک میں پسیج گئے۔ دیر تک لالہ رخ کے قد و قامت، رنگ روپ پر دل ہی دل میں تبصرہ کرتے رہے۔ حکیم صاحب نے اب تک اس کی شادی کیوں نہیں کی اور کی ہے تو اِس کا شوہر کہاں ہے۔ لڑکی کی عمر بھی انہیں خاصی لگی تھی۔ وہ دیر تک ان ہی خیالوں میں الجھے رہے۔

ممتاز صاحب کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ گھنٹی بجا دیتے۔ مہتاب آتی اور تعمیلِ حکم کرتی۔ حسب دستور ممتاز صاحب نے گھنٹی بجائی تو مہتاب کی جگہ لالہ رخ کی آواز آئی۔

''مہتاب گھر پر نہیں ہے، آپ کو کیا چاہئے؟''

ممتاز صاحب نے کہا۔ ''میرے کولر کا پانی ختم ہو گیا ہے، پینے کے لئے پانی مل جائے گا؟''

چند لمحوں بعد لالہ رخ نے دروازے کی اوٹ سے پانی کا گلاس پیش کیا۔ ''پانی حاضر ہے۔ مہتاب آئے گی تو کولر بھروا دیا جائے گا۔''

ممتاز صاحب بڑھے اور گلاس لالہ رخ کے ہاتھ سے یوں لیا کہ دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں۔

ممتاز صاحب نے کہا۔ ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں!''

لالہ رخ نے برجستہ کہا۔ ''شرم دامن گیر ہے!''

ممتاز صاحب اور لالہ رخ دونوں مختلف بہانے سے روزانہ کچھ نہ کچھ گفتگو کر لیا

کرتے۔ دن بہ دن التفات اور تعلقات استوار ہوتے گئے۔ ممتاز صاحب کو معلوم ہو گیا کہ لالہ رخ ابھی تک کنواری ہے۔ لالہ رخ کو بھی پتہ چل گیا کہ ممتاز صاحب کی بیگم کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ مجرد زندگی گزار رہے ہیں۔

ممتاز علی اب شہر میں زیادہ رہنے لگے تھے۔ وہ اور لالہ رخ ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ مہتاب کو کسی بہانے باہر بھیج دیا جاتا اور دونوں خوب گھل مل کر باتیں کرتے۔ باتوں باتوں میں دونوں ازدواجی زندگی میں منسلک ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے لیکن حکیم صاحب کی اجازت کی ضرورت تھی۔ حکیم صاحب بالکل لاپروا انسان تھے۔ انہیں بیٹی کی شادی کی کوئی فکر ہی نہ تھی۔ دبی دبی زبان میں مہتاب کہتی تو حکیم صاحب اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیتے۔

ممتاز صاحب نے لالہ رخ سے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی حکیم صاحب سے مل کر پیغام دینے کی کوشش کریں گے۔ جمعہ کے دن حکیم صاحب مطب بند رکھتے تھے۔ اس شام ممتاز صاحب نے گھنٹی بجائی۔ مہتاب آئی تو ممتاز صاحب نے دریافت کیا۔

حکیم صاحب گھر پر ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

چند لمحوں بعد مہتاب نے آکر بتایا۔ "حکیم صاحب موجود ہیں، آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ممتاز صاحب اور حکیم صاحب مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ موقع ملتے ہی ممتاز صاحب نے ان سے ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں پوچھا۔ حکیم صاحب نے افسردگی سے کہا۔

"بیگم کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ ایک بیٹی لالہ رخ ہے اور ایک ملازمہ مہتاب میرے گھر کے افراد میں شامل ہے۔"

ممتاز علی نے پوچھا۔ "بیٹی کی شادی ہو گئی ہے؟"

"یہی تو فکر مجھے کھائے جا رہی ہے۔ کوئی ڈھنگ کا لڑکا ملتا ہی نہیں۔ ماں ہوتی تو دوڑ دھوپ کرتی۔

مجھ سے یہ کام نہیں ہوتا۔"

"ڈھنگ کے لڑکے سے آپ کی کیا مراد ہے؟" ممتاز صاحب نے پوچھا۔

"بھئی کھاتے پیتے شریف گھرانے کا لڑکا ہو، خوبرو ہو، تندرست ہو اور پڑھا لکھا ہو۔"

ممتاز صاحب نے کہا۔ "حکیم صاحب آپ مجھے کیسا انسان سمجھتے ہیں؟"

"میاں آپ تو ماشاء اللہ ایک اچھے اور شریف انسان ہیں۔" حکیم صاحب نے کہا۔

ممتاز صاحب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "حضور آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمالیں، آپ کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی اور میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

یہ سنتے ہی حکیم صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور تند لہجے میں بولے۔ "میاں آپ کو یہ کہنے کی براہ راست جرأت کیسے ہوئی۔ اول تو رشتہ ناتا بزرگوں کا کام ہے، دوئم آپ رئیس ہوں گے اپنے گھر کے۔ میں آپ کا حسب نسب نہیں جانتا اور آپ بھی میرے متعلق نہیں جانتے پھر یہ الفاظ آپ کے منہ سے نکلے کیسے۔ میں آپ کو ایک شریف انسان سمجھتا تھا کہ کرامت علی نے آپ کا بہت ہی اچھے الفاظ میں تعارف کرایا تھا، میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ آپ کی شرافت کا پول کھل گیا، اب میرے اور آپ کے تعلقات ختم ہوئے۔ آپ اپنی رہائش کا کوئی اور بندوبست کر لیں اور میرا مکان فوراً خالی کر دیں۔"

ممتاز صاحب پسینے پسینے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے وہ کہہ پائے۔ "چند دنوں کی مہلت دے دیجئے، میں کوئی اور انتظام کر لوں گا۔"

ممتاز صاحب نے ساری روداد لالہ رخ کو سنائی۔ لالہ رخ نے بتایا کہ بابا بہت طیش میں تھے، مجھ سے باز پرس کر رہے تھے کہ کہیں آپ سے میری راہ و رسم تو نہیں ہو گئی۔

"میں نے انہیں یقین دلایا کہ میرا مکان میں رہنے والے کسی فرد سے کیا تعلق۔ پتہ نہیں انہیں یقین آیا بھی یا نہیں۔" لالہ رخ نے بتایا۔ "مجھے بابا سے یہی توقع تھی۔ وہ حکیم ضرور ہیں لیکن انسانی

جذبات وحسیات کا کوئی علم نہیں رکھتے۔''

''اگر تم واقعی شادی پر آمادہ ہو تو کیا میرے لئے تم اپنے والد کو چھوڑ سکو گی؟'' ممتاز صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے لالہ رخ سے پوچھا۔

''ہر بیٹی کو شادی کے بعد ماں باپ کا گھر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔'' لالہ رخ نے جواب دیا۔

''لیکن تمہیں شادی سے پہلے ہی یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔'' ممتاز علی نے کہا۔ پھر انہوں نے اپنے منصوبے کی تفصیل بتائی۔ ''میں اپنے ایک دوست کے گھر سارا انتظام کرلوں گا۔ قاضی گواہ سب وہاں موجود ہوں گے اور وہیں نکاح پڑھوا لوں گا۔ تیاری کرلو، کل دن کے اجالے میں ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ حکیم صاحب اس وقت مطب میں ہوں گے، تم مہتاب کو کہیں دور بھیج دینا۔''

لالہ رخ ذہنی طور پر تیار ہوگئی۔ اگلے دن لالہ رخ نے مہتاب کو خیریت لانے کے لئے اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں بھیج دیا۔ ادھر ممتاز صاحب سواری لے کر آگئے اور دونوں دن کی روشنی میں گھر سے نکل گئے اور حکیم صاحب اپنے مریضوں کا نبض ہی دیکھتے رہ گئے۔

دوست کے گھر سارا انتظام مکمل تھا۔ دونوں کا نکاح ہوگیا اور دونوں ازدواجی زندگی میں منسلک ہوگئے۔

حکیم صاحب مطب سے گھر آئے تو نہ ملازمہ تھی اور نہ لالہ رخ۔ حکیم صاحب ان لوگوں کو موجود نہ پا کر سخت پریشان ہوئے اور اضطراری کیفیت میں اس کمرے سے اس کمرے میں جاتے اور پھر لوٹ کر ڈرائنگ روم میں آجاتے۔ حکیم صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا تھے کہ ان کی ملازمہ مہتاب آگئی۔ حکیم صاحب اسے دیکھتے ہی برس پڑے۔

''کہاں مرگئی تھی؟''

''مجھے تو چھوٹی بی بی نے سلطانہ کے گھر بھیجا تھا، میں وہیں سے آرہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''چھوٹی بی بی کہاں ہیں؟''

''میں تو ان کو گھر پر ہی چھوڑ کر گئی تھی میاں۔''

حکیم صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔''ادھر کرایہ دار کے یہاں جا کر دیکھو۔ آخر لالہ رخ گئی کہاں؟''

مہتاب گئی اور واپس چلی آئی۔''وہ گھر تو خالی پڑا ہے میاں۔ شاید ممتاز صاحب گاؤں چلے گئے۔''

حکیم صاحب ہیجانی کیفیت میں کبھی چلتے، کبھی بیٹھ جاتے۔ اسی عالم میں رات گزر گئی۔ حکیم صاحب کو یقین ہو گیا کہ ممتاز صاحب نے لالہ رخ کو اغوا کیا ہے۔ چنانچہ تھانے جا کر رپورٹ درج کرائی کہ ممتاز احمد نے ان کی لڑکی لالہ رخ کو معہ طلائی زیورات کے اغوا کر لیا ہے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا اور ضروری کارروائی ہونے لگی۔ اگلے دن پولیس نے لالہ رخ کو ممتاز احمد کے گھر سے برآمد کر لیا اور ممتاز صاحب کو گرفتار کر لیا۔ ممتاز صاحب ہزار کہتے رہے کہ لالہ رخ ان کی منکوحہ ہے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ پولیس نے ایف آئی آر کے تحت کارروائی کی تھی اور اب ان کو عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔

پولیس نے چالان داخل کر دیا اور ممتاز احمد اور لالہ رخ کو عدالت میں پیش کر دیا۔ مقدمہ چلنے لگا۔ لالہ رخ نے مجسٹریٹ کے سامنے اپنے بیان میں کہا۔

''میں معاشرے کی ستائی ہوئی ۳۲ سال کی بالغ عورت ہوں۔ میرے والد کو میری شادی کی کوئی فکر نہ تھی۔ میری ماں عرصہ ہوا انتقال کر گئیں۔ میں نے بشری تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی زندگی کو رائیگاں ہونے سے بچانے کے لئے ممتاز احمد سے اپنی مرضی کے مطابق شادی کر لی۔ نکاح نامہ موجود ہے، قاضی اور گواہ بھی موجود ہیں۔ جہاں تک طلائی زیورات کا تعلق ہے تو وہ میری ماں کی زندگی ہی میں میرے جہیز کے لئے رکھا گیا تھا سو میں اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ میں اپنے والد کے ساتھ جو حکیم ہوتے ہوئے بھی انسانی جذبات اور بشری تقاضوں کو نہیں سمجھتے، جانے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں۔ میں ممتاز احمد کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں عدالت سے

انصاف کی طلب گار ہوں۔"

عدالت نے سارے دلائل سنے، ممتاز احمد اور لالہ رخ کے موقف کو سنا، نکاح نامہ دیکھا، قاضی اور گواہان کے بیانات کو سن کر فیصلہ صادر کر دیا۔ مجسٹریٹ نے فیصلے میں لکھا کہ چونکہ لالہ رخ بالغ ہے اور بقیدِ ہوش وحواس ممتاز احمد سے شرعی طور پر شادی کے رشتے میں منسلک ہوئی ہے، اس لئے لالہ رخ کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرے۔ جیسا کہ انکشاف ہوا کہ زیورات اس کے جہیز کے لئے تھے اس لئے اسے حق ہے کہ زیورات کو اپنے تصرف میں رکھے۔ حکیم نصیر الدین جیسے والد کے لئے یہ واقعہ عبرت کا مقام رکھتا ہے جو اپنی غفلت اور جھوٹی انا میں رہ کر اپنی لڑکیوں کو بغاوت پر مجبور کرتے ہیں۔ ملزمان کو اسی وقت رہا کر دیا جائے۔

فیصلہ سن کر حکیم صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر دوڑ کر اپنی بیٹی اور داماد کو گلے لگا لیا اور بولے۔

"بیٹا یہ مکافاتِ عمل ہے۔ میں نے بھی اپنے بزرگوں سے بغاوت کر کے کورٹ میرج کی تھی۔"

☆☆☆

فرض

عظیم احمد بہت ہی خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی بیگم بہت ہی نفیس خاتون تھیں۔ خالق ارض وسما نے انہیں دو اولادیں عطا کی تھیں۔ بیٹے کا نام شمیم احمد اور بیٹی کا نام رخسانہ تھا۔ کاروانِ حیات رواں دواں تھا کہ بیگم شمیم علیل ہو گئیں۔ انہیں یرقان ہو گیا تھا۔ ہر ممکن علاج کے بعد بھی ان کی صحت بحال نہ ہوئی۔ دن بہ دن حالت بگڑتی ہی گئی اور آخر میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ بیگم Liver Cancer میں مبتلا ہیں۔ دو ماہ بیگم حیات وموت کی کشمکش میں رہ کر اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔

عظیم احمد اور بچوں کے لئے یہ سانحہ بادِ سموم لے کر آیا۔ بچے ماں کی موت کے بعد خود کو بے سہارا محسوس کرنے لگے۔ عظیم احمد کی زندگی میں بھی بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی نگہداشت کا تھا۔ عظیم احمد دن بھر اپنی ملازمت میں گزارتے اور گھر میں بچوں کی دلجوئی کے لئے کوئی نہ ہوتا۔ عظیم احمد کو مجبوراً دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

کئی رشتے آئے لیکن عظیم احمد نے ذاکر حسین صاحب کی صاحبزادی کو اس لئے ترجیح دی کہ وہ خاصی بڑی عمر کی تھیں۔ شادی سے قبل عظیم احمد نے بتا دیا تھا کہ ان کے دو بچے پہلی بیوی سے ہیں۔ ان پر شفقت کی نظر رکھنی ہوگی تا کہ وہ ماں کی کمی محسوس نہ کریں۔ سب لوگوں نے عظیم احمد سے اتفاق کیا کہ بچوں کی دلجوئی تو فرض اولین ہے۔ ہر معقول انسان بن ماں کے بچوں سے

محبت کرے گا اور شفقت سے پیش آئے گا۔

شادی ہوگئی اور نئی بیگم نے گھر کا انتظام سنبھال لیا۔ کچھ ہی دنوں بعد بچوں پر سختی شروع ہوگئی۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور پھر عظیم احمد کو بچوں کے خلاف بھڑکانے کے نت نئی سازشوں کا جال بنتیں اور بچوں کو باپ سے ڈانٹ پلواتیں۔

بچوں کے امتحان کا نتیجہ آیا تو شمیم تو اچھے نمبروں سے پاس کر گیا لیکن رخسانہ فیل ہوگئی۔ بیگم کو موقع مل گیا۔ انہوں نے عظیم احمد سے کہا لڑکی پڑھائی میں بہت کمزور ہے۔ اسے اسکول میں رکھنا وقت اور پیسے کی بربادی ہے۔ اس کو گھر پر ہی پڑھانا ہوگا۔ عظیم احمد بھی بیگم سے متفق ہوگئے اور رخسانہ کا اسکول جانا بند ہوگیا۔ شمیم بدستور اسکول جاتا رہا۔ رخسانہ کو پڑھانے کی بجائے گھر کے کام کاج میں لگا دیا گیا۔ بات بات پر ڈانٹ پھٹکار اور باپ سے شکایت کر کے ان سے بھی ڈانٹ پلوائی جاتی۔ رخسانہ کی قسمت میں مایوسی اور رونے کے سوا کچھ نہ رہا۔

اسی اثناء میں بیگم عظیم کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس اضافے کے بعد رخسانہ کا کام اور بڑھ گیا۔ سارے گھر کے کاموں کا بوجھ اس پر آن پڑا۔ بیگم عظیم کو تو بہانہ مل گیا۔ وہ بچے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی اور گھر کا پورا کام رخسانہ کو کرنا پڑتا۔ عظیم احمد پر دوسری بیگم کا جادو ایسا چلا کہ وہ بچوں کی طرف سے قطعی غافل ہوگئے۔

خدا خدا کر کے شمیم اچھے نمبر سے میٹرک پاس کر گیا۔ اب اس کی خواہش کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی ہوئی۔ باپ سے اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن بیگم عظیم درمیان میں کود پڑیں کہ کالج کے اخراجات بہت ہوتے ہیں اس لئے کالج میں پڑھوانا ممکن نہیں ہوگا۔ شمیم کو چاہئے کہ ملازمت کر کے باپ کا ہاتھ بٹائے۔ عظیم احمد کے چاہنے کے باوجود شمیم کالج میں داخل نہ ہوسکا۔

عظیم احمد کی نوزائیدہ بچی ایک دن پلنگ سے گر گئی۔ رخسانہ باورچی خانے میں تھی اور

بیگم دوسرے کمرے میں کام سے گئی ہوئی تھیں۔ بچی کے رونے کی آواز سن کر رخسانہ اور بیگم عظیم دونوں ہی بچی کی طرف دوڑیں۔ بیگم عظیم نے بچی کو اٹھا کر پلنگ پر رکھا اور رخسانہ کو مارنا اور کوسنا شروع کر دیا۔ وہ جتنا مار سکتی تھیں مار کر رخسانہ کو ادھ موا کر دیا۔ وہ کہتی جا رہی تھی کہ بچی کے گرنے میں اس کا کیا قصور تھا؟ مگر بیگم کچھ سننے کے لئے تیار نہ تھیں۔

شمیم باہر سے آیا تو بہن کو سسکتا ہوا پایا۔ اس کے رخسار پر چوٹ کے نشان دکھائی دیئے۔ اس نے بہن سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ رخسانہ نے پوری روداد بھائی کو سنا دی۔ شمیم نے بیگم عظیم سے کہا کہ رخسانہ کوئی آیا نہیں تھی کہ بچی کی رکھوالی کی ساری ذمہ داری اسی پر ہوتی۔ بیگم عظیم شمیم کے تیور کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئیں اور شمیم کو بھی برا بھلا کہنے لگیں۔ شمیم نے کہا کہ آپ اپنی حد میں رہیں، ہم لوگوں نے بہت ستم سہہ لئے، اب مزید ظلم برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

یہ تکرار چل ہی رہی تھی کہ عظیم احمد آ گئے۔ شمیم نے پہل کرتے ہوئے کہا۔

''ابو، رخسانہ کی حالت دیکھیں۔ اس کو اس بری طرح سے مارا پیٹا گیا ہے کہ اس کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ ہم لوگ روزانہ ظلم سہتے سہتے بیزار ہو گئے ہیں اور اب مزید ظلم سہنے کی سکت نہیں ہے۔ آج آپ فیصلہ کریں۔''

عظیم احمد نے کبھی شمیم کو اس تیور میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموش سنتے رہے۔ پھر بیگم سے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے۔

''اس کمینی رخسانہ کی بے توجہی سے میری بیٹی پلنگ سے گر پڑی۔'' بیگم نے غصے سے کہا۔

''اس میں رخسانہ کا کیا قصور ہے؟ بچی کی دیکھ بھال تمہیں خود کرنی چاہئے''، عظیم احمد نے کہا۔

''آپ بھی ان لوگوں کی حمایت میں مجھے ہی مورد الزام ٹھہرانے لگے۔'' بیگم غصے میں بولیں۔

''اب اگر ایسی بات ہے تو اس گھر میں یا تو آپ کے بچے رہیں گے یا میں رہوں گی۔''

''کوئی کہیں نہیں جائے گا۔ سب اسی گھر میں رہیں گے۔'' عظیم احمد نے فیصلہ سنا دیا۔

اس وقت تو بات ختم ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد عظیم احمد اپنے کمرے میں گئے۔ بیگم عظیم بھی وہاں پہنچ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد عظیم احمد نے بچوں کو بلایا اور شمیم کی پٹائی شروع کردی۔ ساتھ ہی وہ کہتے جارہے تھے۔

''تو نے ماں کو برا بھلا کہا ہے اور ان سے لڑائی کی ہے۔''

''میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' شمیم کہتا رہا۔ ''میں نے انہیں کوئی برا بھلا نہیں کہا۔''

عظیم احمد نے اپنے بچوں کو دھمکی دی کہ اگر پھر کبھی شکایت سنی تو دونوں کو گھر سے نکال دیا جائے گا۔

''ابو یہ آپ انصاف نہیں کررہے ہیں۔'' شمیم نے کہا۔

''انصاف کے بچے، دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے ورنہ حلیہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔''

دونوں بچے سہمے اور سسکتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئے۔

''رخسانہ اب ہم لوگوں کا یہاں گزر نہیں ہو سکے گا۔'' شمیم نے رخسانہ سے کہا۔ ''پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اب ہم لوگوں کو کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈنا ہوگا۔ تم صبر کرو میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔''

دوسرے دن شمیم نے پرائمری سے میٹرک تک کی اپنی ساری کتابیں اکٹھی کیں اور انہیں بازار میں لے جا کر فروخت کردیں۔ اس ترکیب سے ایک معقول رقم اس کے ہاتھ آگئی۔ اس نے رات کو بہن کو بتایا کہ وہ اپنی ضروری اشیا سمیٹ لے۔ صبح سویرے یہاں سے نکل جانا ہے۔ دونوں صبح سویرے گھر سے نکل کر بس کے اڈے پہنچے اور وہاں سے ماموں کے گھر کے لئے روانہ ہوگئے۔ ماموں اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ کافی پوچھ گچھ کے بعد ممانی نے انہیں پہچانا اور گھر کے اندر بلا لیا۔ ماموں جب گھر آئے تو ان لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ماموں کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ ماموں نے غنیمت جانا کہ گھر میں دو بچے آگئے۔ شمیم نے پوری روداد ماموں کو سنادی۔

''میں تو بہن کے انتقال کے بعد ہی تم لوگوں کو لینے پہنچا تھا لیکن عظیم بھائی نے انکار کردیا تھا۔''

ماموں نے کہا۔ ''خیر، جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب یہی تمہارا گھر ہے۔ اطمینان سے رہو۔''

''ماموں آپ رخسانہ کو سنبھالئے۔ میں انشاء اللہ جلد ہی کوئی ملازمت ڈھونڈ کر آپ پر زیادہ دن بوجھ نہیں بنوں گا۔''

''تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔'' ماموں بولے۔ ''تو ابھی پڑھے گا۔ پڑھ کر بڑا آدمی بنے گا۔ مجھ سے جو ہو سکے گا تیرے لئے کروں گا۔ تو جتنا پڑھ سکے گا تجھے پڑھاؤں گا۔ رخسانہ بیٹی بھی پڑھے گی۔ تو کالج میں داخلے کا انتظام کر اور جتنی فیس درکار ہو مجھ سے لے جا۔''

شمیم کا داخلہ ایک مقامی کالج میں ہو گیا۔ رخسانہ کی پڑھائی بھی شروع ہو گئی۔ شمیم ہر امتحان میں امتیازی نمبر سے پاس کرتے ہوئے ٹیکسٹائل انجینئر ہو گیا اور ساتھ ہی ایم۔ بی۔ اے کی بھی سند حاصل کر کے ایک فیکٹری میں نائب پروڈکشن منیجر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس نے فیکٹری کی پیداوار کو بہت بڑھا دیا۔ فیکٹری کا مالک سیٹھ فدا حسین شمیم کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اسے پروڈکشن منیجر بنا دیا۔

رخسانہ نے بھی بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ ماموں نے شمیم سے مشورہ کر کے رخسانہ کی شادی ایک انجینئر سے کر دی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ شارجہ چلی گئی۔ اب ماموں کو شمیم کی شادی کی فکر ہوئی۔ ادھر ادھر تلاش جاری تھی کہ سیٹھ فدا حسین نے اپنی لے پالک سے شمیم کی شادی کی تجویز پیش کر دی۔ شمیم نے ماموں سے رائے مانگی۔ ماموں نے کہا اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ شمیم کی شادی بھی ہو گئی۔ شمیم کو سیٹھ صاحب نے فیکٹری کا میجنگ ڈائرکٹر بنا دیا اور سیٹھ صاحب نے مطمئن ہو کر پوری ذمہ داری شمیم پر ڈال دی۔ شمیم کے ماموں بہت خوش تھے۔ شمیم اور رخسانہ دونوں ماموں کا احترام کرتے اور اولاد ہی کی طرح برتاؤ کرتے۔

عظیم احمد کو بچوں کے اس طرح چلے جانے سے تشویش تو ہوئی لیکن بیگم کے خوف سے بچوں کو تلاش کرنے کی زحمت نہیں فرمائی۔ بلکہ آہستہ آہستہ وہ ان لوگوں کو بھول بیٹھے۔ اللہ کی لاٹھی

بے آواز ہوتی ہے۔ اچانک عظیم احمد کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئیں۔ انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد بتایا کہ انہیں بڑے شہر کے کسی مشہور نیورو سرجن سے دکھایا جائے جہاں ان کی ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن ہوگا۔ معلوم ہوا کہ بڑے شہر میں جا کر علاج کرانے میں تقریباً دو ڈھائی لاکھ خرچ ہوں گے۔ عظیم احمد کے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔ انہوں نے بیگم کو کہا کہ مکان فروخت کر دیں تا کہ علاج ہو سکے۔

''آپ تو معذور ہو چکے۔ اگر مکان بھی فروخت کر دیں گے تو آئندہ کا سہارا کیا ہوگا۔ البتہ آپ کے لئے مدد کی اپیل اخبار میں چھپوائی جا سکتی ہے۔ بہت سے مخیّر بندے ہیں جو آپ کی مدد پر آمادہ ہو جائیں گے۔''

شمیم نے اخبار میں اشتہار دیکھا۔ نام اور پتہ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ یہ اس کے والد کے علاج کے لئے اپیل کی گئی ہے۔ تقریباً بیس سال ماضی میں جا کر شمیم نے سوچنا شروع کیا۔ اپنے والد کے سلوک کو یاد کر کے تلملانے لگتا لیکن باپ کی بے بسی اور معذوری پر اسے ترس آنے لگتا۔ وہ عجب کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے باپ کی مدد کو پہنچے گا۔

وہ اپنے پرانے گھر پہنچا۔ اشتہار کے حوالے سے ان کی مدد کی پیشکش کی۔ بیٹے میں اتنا تغیر آ گیا تھا کہ عظیم احمد پہچان نہ سکے، ویسے ان کی بینائی بھی بہت کمزور ہو چکی تھی۔

شمیم اپنے والد کو اپنے گھر لے آیا اور شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سب کی رائے آپریشن کے حق میں تھی۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق عظیم احمد کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں ان کا آپریشن کامیاب رہا۔ تین ہفتوں کے اندر وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنے پھرنے لگے۔ وہ شمیم کو سیٹھ کی حیثیت سے جانتے تھے اور اسے سیٹھ یا محسن کہہ کر مخاطب کرتے۔

اب عظیم احمد کو اپنی بیوی اور بچے یاد آئے۔ انہوں نے شمیم سے کہا۔

''سیٹھ صاحب اب میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ میری بیگم اور بچی کی کوئی خبر نہیں ملی نہ وہ آئے نہ کوئی پیغام آیا۔''

''ابھی تو آپ کا علاج باقی ہے۔'' شمیم نے کہا۔

''میں ان لوگوں سے مل کر آ جاؤں گا۔'' عظیم احمد نے بڑی لجاجت سے کہا۔

شمیم نے ان کے جانے کا انتظام کر دیا۔ گاڑی اور ڈرائیور ان کے حوالے کر دیا۔ عظیم احمد اپنے گھر پہنچے۔ گھنٹی بجائی۔ ایک اجنبی شخص نے دروازہ کھولا۔

''میں عظیم احمد ہوں۔ اس گھر کا مالک۔ میری بیگم اور بیٹی کہاں ہیں۔''

''یہ مکان فروخت ہو چکا ہے اور اب اس مکان کا مالک میں ہوں۔'' اجنبی نے کہا۔

''وہ لوگ آخر کہاں گئے؟''

''ان کا اسی شہر میں کوئی فلیٹ ہے، وہیں منتقل ہو گئے ہیں۔''

عظیم احمد نے ڈرائیور سے چلنے کو کہا۔ فلیٹ پہنچے تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا وہاں کوئی کرایہ دار ہیں اور بیگم کہیں اور رہتی ہیں۔ عظیم احمد بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ شمیم نے ان کی آنکھ کا آپریشن بھی کروا دیا اور ان کی بینائی واپس آ گئی۔ پھر بھی وہ شمیم کو پہچان نہ سکے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شمیم اتنا بڑا سیٹھ ہو چکا ہو گا۔

ایک دن شمیم کے ماموں آئے اور عظیم احمد سے خیریت پوچھی۔

''بھائی صاحب کیسی طبیعت ہے؟''

عظیم احمد نے جواب دینے کی بجائے پوچھا۔ ''آپ یہاں کیسے آ گئے؟''

''جیسے آپ اپنے بیٹے کے گھر میں ہیں، اسی طرح میں اپنے بھانجے کے گھر میں آیا ہوں۔''

عظیم احمد حیرت زدہ ہو کر بولے۔ ''بھائی یہ کیا کہہ رہے ہو۔؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بھائی صاحب۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شمیم بھی وہاں پہنچ گیا۔ شمیم کو دیکھتے ہی عظیم احمد اٹھے اور لپٹ کر زار و قطار رونے لگے اور گڑگڑا کر بیٹے سے معافی مانگنے لگے۔

شمیم نے انہیں دلاسا دیا۔ ''ابھی آپ کی آنکھ بنی ہے، رونے سے بینائی میں فرق آجائے گا۔ آپ ذرا صبر سے کام لیں ورنہ آپ کی آنکھ کو نقصان پہنچے گا۔''

عظیم احمد نے کہا۔ ''بیٹا تمہارا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر۔ میری بیوی اور بیٹی تو ساری جائداد کو اپنے نام کرا لینے کے بعد مجھے معذور سمجھ کر بے یار و مددگار چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا۔ کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

''ابو میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔'' شمیم نے کہا۔

''اللہ مجھے معاف کرے۔'' عظیم احمد بولے۔ ''میں نے دوسری بیوی کی باتوں میں آ کر تم لوگوں کے ساتھ بے اعتنائی برتی اور ناروا سلوک کیا۔ میں اس پر بہت پشیمان ہوں۔ کاش میں بھی اپنا فرض ادا کرتا۔''

☆☆☆

رشتے کی زنجیر

محی الدین اور شرافت حسین پڑوسی تھے۔ دونوں کے مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان بھائیوں جیسے خلوص وسلوک تھے۔ دونوں کے بچے ساتھ کھیلتے اور ساتھ پڑھتے۔ یہ سلسلہ ایک عرصے سے قائم تھا۔ محی الدین وفاقی حکومت کے ملازم تھے اور شرافت حسین صوبائی سکریٹریٹ میں کام کرتے تھے۔

وقت کا کارواں رواں دواں تھا کہ مشرقی پاکستان بادِ سموم کے جھونکے کی لپیٹ میں آ گیا اور زہریلی ہوائیں طوفانی شکل اختیار کر گئیں۔ سازشوں کے جال بنے جانے لگے۔ عوامی لیگ کو اکثریت حاصل ہونے کے باوجود حکومت بنانے کا موقع نہ دے کر اور یحییٰ خاں نے جو فوجی کارروائی کے ذریعہ مجیب الرحمٰن کی آواز کو دبانے کی کوشش کی اس کے ردعمل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان بدگمانی کا خلیج اتنا وسیع ہو گیا کہ اس کو پاٹنا ممکن نہ ہو سکا۔ بغاوت کی لہریں اٹھیں اور روس و ہندوستان کی مدد سے پاکستان ٹوٹ گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ ساتھ ہی وہاں کے اردو بولنے والوں کی جان پر بن آئی۔ لوٹ

روایت کے قیدی

مار کا بازار گرم ہو گیا۔ غیر بنگالیوں کی زبوں حالی دیدنی تھی۔ ہر آدمی سہما ہوا، گھر میں خوفزدہ بیٹھا اللہ کو یاد کرتا۔ رو رو کر دعائیں مانگتا لیکن دعائیں بابِ اثر تک نہیں پہنچ پاتیں۔ بربادی کا سلسلہ جاری رہا اور غیر بنگالیوں کو پاکستان سے محبت اور وفاداری کی سزا ملتی رہی۔

۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام تقریباً چار بجے شام، شرافت حسین نے گھبرائے ہوئے محی الدین

کے دروازے پر دستک دی اور کہا:

''بھائی، تم لوگ فوراً اپنا گھر چھوڑ دو اور میرے گھر آ جاؤ۔ شور سن رہے ہو جو بہت قریب سے آ رہی ہے۔ بہاریوں کو سب لوٹ رہے ہیں اور مار رہے ہیں۔ تم لوگ میرے گھر میں رہو گے تو ان لوگوں کے مظالم سے بچ سکو گے۔''

محی الدین یہ سنتے ہی اپنی بیگم اور بیٹے کو لے کر شرافت حسین کے گھر منتقل ہو گئے۔

چند ساعت بعد ہی ساٹھ ستر مکتی باہنیوں کا جتھا آیا اور محی الدین صاحب کے گھر کے سامنے للکارنا شروع کیا ''کہاں ہے بہاری باہر آ ؤ۔'' جب کوئی جواب نہ ملا تو سب مکان پر ٹوٹ پڑے اور پورے گھر کو روند ڈالا۔ جس کو جو ہاتھ لگا اپنا لیا اور اس طرح لوٹ مار کے بعد کسی اور گھر کا محاصرہ کیا۔ مارا، لوٹا اور چل دیئے۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ جان و مال لٹتے رہے، عزتیں پامال ہوتی رہیں۔ انتقام کی آگ بھڑکتی رہی اور پورا معاشرہ تماشہ دیکھتا رہا۔

بنگالیوں کو جب پتہ چلا کہ شرافت حسین نے کچھ غیر بنگالیوں کو پناہ دے رکھی ہے تو کچھ لوگ مکتی باہنی کی شکل میں آئے اور شرافت حسین سے مطالبہ کیا کہ جن غیر بنگالیوں کو اپنے گھر میں رکھا ہے انہیں حوالے کریں۔ شرافت حسین نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ بات کچھ بڑھی تو محلے والے آ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا اور وقتی طور پر بلا ٹل گئی۔ لیکن دوسرے دن کچھ نوجوان پھر آئے اور شرافت حسین سے پھر وہی سوال کیا اور کافی دباؤ ڈالنے لگے۔ محلے والے بھی ان نوجوانوں کو مسلح دیکھ کر خاموش رہے۔

''اگر بہاریوں کو ہم لوگوں کے حوالے نہیں کرو گے تو ہم لوگ خود گھر میں گھس کر ان لوگوں کو نکال لائیں گے۔'' نوجوانوں نے کہا۔

''میری زندگی میں یہ ممکن نہیں۔'' شرافت علی نے کہا۔

یہ تکرار چل ہی رہی تھی کہ شرافت حسین کا بھانجا سراج الدولہ آ گیا جو کمانڈر ٹیپو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ مکتی باہنی کے بڑے عہدہ داروں میں تھا۔ اس نے ماحول کا جائزہ لیا اور شرافت سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''ماما کیا بات ہے؟''
شرافت حسین نے ساری باتیں تفصیل سے سنا دیں۔ ٹیپو نے ان نوجوانوں سے کہا۔
''تم لوگ جاؤ، میں خود اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔''
ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد ٹیپو نے کہا۔'' ماما، بہاری بنگلہ دیش کے غدار ہیں اور قابل گردن زدنی ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو پناہ دے کر جرم کا ارتکاب کیا ہے۔''
''محی الدین بہت شریف آدمی ہیں۔ بیس سال سے ہم لوگ بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ ان کا بیٹا ہارون اور میری بیٹی نیلوفر ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ میرا بیٹا عامر کراچی میں محی الدین صاحب کے بھائی کے ساتھ رہ کر کراچی میں پڑھ رہا ہے۔ میں ان مراسم اور احسانات کو کیسے بھلا دوں۔ یہ تو معصوم لوگ ہیں، اگر ان کے ساتھ کوئی برا سلوک ہوا تو میں پہلے اپنی قربانی دوں گا، پھر ان لوگوں پر آنچ آنے دوں گا۔'' شرافت حسین نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔
''ماما قصور بے قصور کا سوال نہیں ہے، سوال بہاریوں کو بنگلا دیش سے پاک کرنے کا ہے۔'' ٹیپو نے کہا۔
''ٹھیک ہے تم مکتی باہنی کے بڑے افسر ہو اپنا فرض ادا کرو۔ پہلے مجھے قتل کرو اور روندتے ہوئے گھر کے اندر جا کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرو۔'' شرافت حسین نے کہا۔
ٹیپو اپنے ماموں کی باتیں سن کر ہکا بکا رہ گیا اور کہا۔'' ماموں اتنے جذباتی نہ ہوں، بات سمجھنے کی کوشش کریں، یہ حکومت کا فیصلہ ہے۔''
''ٹھیک ہے، اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو جاؤ اور کچھ مکتی باہنیوں کو بھیج دو تاکہ ہم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دے اور مجاہدِ عظم کا خطاب حاصل کر لے۔'' شرافت حسین نے کہا۔
ٹیپو شرافت حسین کو حد سے زیادہ جذباتی دیکھ کر خاموش ہو گیا اور کچھ دیر بعد اس نے کہا۔'' ماما آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں اور جو بھی آپ کے پاس آئے اسے کہئے گا کہ وہ پہلے مجھ سے بات کر لے۔ میں مقامی تھانے والوں کو بھی ہدایت کرتا جاؤں گا کہ وہ آپ لوگوں کا خیال رکھے۔ میں بھی اکثر خبر لیتا رہوں گا اور کبھی کبھی حاضری بھی لگا جاؤں گا۔ آپ کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت

نہیں۔کوئی الجھن ہوتو فوراً مجھے ٹیلی فون کر لیجئے گا۔'' ٹیپو نے کہا۔
شرافت حسین نے کارڈ لے لیا اور بھانجے کو روتے ہوئے بغل گیر کرلیا اور مطمئن ہوگئے۔
وقت گزرتا گیا اور ایک عرصے کے بعد حالات کچھ معمول پر آنے لگے۔ غیر بنگالی، دلالوں کے ذریعہ سفرنامہ بنوا کر ہندوستان جانے لگے۔ ان میں سے اکثر نیپال ہوتے ہوئے کراچی پہنچنے لگے۔ محی الدین کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو ان کا بھی ارادہ پاکستان ہجرت کا ہوا۔ انہوں نے شرافت حسین سے مشورہ کیا۔ شرافت حسین نے محی الدین کے ارادے کی تائید کی۔
''تم لوگوں کا مستقبل یہاں تاریک ہے، تمہارا ارادہ صائب ہے۔'' شرافت حسین نے کہا۔
محی الدین صاحب کے پاس کچھ زیورات تھے جسے وہ گھر سے نکلتے ہوئے بچا لائے تھے۔ ان زیورات کو فروخت کرنے کے بعد انہیں اتنی رقم مل گئی کہ وہ اپنے سفر کا آغاز کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کا سفرنامہ (Permit) شرافت حسین کی مدد سے دستیاب ہوگیا اور سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ لیکن محی الدین اور شرافت حسین کو کیا خبر کہ اس بچھڑنے کا دو معصوم دلوں پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ ہارون اور نیلوفر ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ان لوگوں نے کھلے بندوں اس کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔
''کیا تم واقعی چلے جاؤ گے ہارون؟'' نیلوفر نے دریافت کیا۔
''کیا کروں، مجبور ہوں۔ موجودہ حالات میں ہم لوگوں کا یہاں رہنا ناممکن ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم لوگوں کی وجہ سے آپ لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑے۔ شاید اللہ کی یہی مرضی ہے۔'' ہارون نے کہا۔
''تمہارے چلے جانے کے بعد میں کیسے جی سکوں گی۔ مجھے تو ابھی سے زندگی میں خلا محسوس ہو رہا ہے۔'' نیلوفر نے کہا۔
''میں اس فیصلے سے خود پریشان ہوں لیکن مجبوری ہے۔ کبھی کبھی نہ چاہنے پر بھی حالات اور واقعات کے سامنے انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔'' ہارون نے کہا۔
آخر اسی کشمکش کی حالت میں دونوں خاندانوں نے اشکبار آنکھوں سے ایک دوسرے

کو خدا حافظ کہا اور محی الدین صاحب معہ اپنی اہلیہ اور بیٹے کے رخصت ہو گئے۔ یہ قافلہ ڈھاکا سے رخصت ہو کر ہندوستان پہنچا اور وہاں سے نیپال ہوتا ہوا ۱۴؍ اگست ۱۹۷۲ء کو کراچی پہنچا۔ ۱۴؍ اگست تو پاکستان کی آزادی کا دن تھا لیکن یہ روشنیوں کا شہر بالکل اداس تھا۔ نہ چراغاں نہ یومِ آزادی کی دھوم دھام۔ اتنے بڑے المیے کے بعد اسے غم زدہ ہی رہنا چاہیے تھا۔ پاکستان پہنچنے پر محی الدین صاحب کی ملازمت بحال ہو گئی اور سات ماہ کی تنخواہ بھی مل گئی اور ماضی کے غم کو فراموش کر کے انہوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ ہارون کی نامکمل تعلیم کو پوری کروائی اور کراچی کی زندگی میں رچ بس گئے۔

وقت گزرتا گیا اور ایک مدت کے بعد پاکستان کے بنگلہ دیش سے سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ خط و کتابت کے علاوہ لوگوں کا آنا جانا بھی شروع ہو گیا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہارون نے پہل کی اور نیلوفر کو خط لکھا:

ڈیر نیلوفر!

امید کہ تم اور تمہارے والدین خیر و عافیت سے ہوں گے۔ ہم لوگ تملوگوں کا احسان زندگی بھر نہیں بھلا سکتے۔ تمہارا 'ہاؤس جاب' ختم ہو گیا ہوگا اور تم ملازمت کر رہی ہوگی۔ معلوم نہیں تمہاری شادی ہوئی یا نہیں۔ میں نے بھی تعلیم مکمل کر لی ہے اور عنقریب 'ہاؤس جاب' پر لگ جاؤں گا۔ مجھے سب سے بڑا دکھ تم سے بچھڑنے کا ہے۔ اکثر تمہاری یاد ستاتی رہتی ہے۔ حالات نے ہم لوگوں کو بچھڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہو سکے تو دیئے ہوئے پتے پر خط کا جواب ضرور دو۔ انتظار رہے گا۔ تم لوگوں کو تو معلوم ہی ہوگا کہ تمہارے بھائی جان عامر کراچی چھوڑ کر امریکہ چلے گئے ہیں۔ چاچا اور چاچی کو میرا اور میرے والدین کا بہت بہت سلام پہنچا دینا۔ امی اور ابو تمہیں دعا سے نواز رہے ہیں۔

فقط تمہارا

ہارون

''کس کا خط ہے بیٹی؟'' شرافت حسین نے پوچھا۔

''ہارون کا خط آیا ہے بابا۔'' نیلوفر نے کو جواب دیا۔

''کیا لکھا ہے بیٹی؟'' شرات حسین نے استفسار کیا۔

نیلوفر نے اپنے والد کو خط دیتے ہوئے کہا۔'' بابا آپ خود پڑھ لیں۔

''بہت سندر اور شریف لوگ ہیں۔'' شرافت حسین نے خط لیتے ہوئے کہا۔

شرافت حسین کی بیگم بھی بہت خوش ہوئیں کہ محی الدین اور ان کے اہل خاندان خیریت سے ہیں۔

''نیلو، تم بھی خط لکھو تا کہ دیرینہ تعلقات کی تجدید ہو سکے۔'' شرافت حسین نے کہا۔

''اچھا بابا۔'' نیلوفر نے کہا۔

''ڈیر ہارون!

تمہارا خط ملا۔ انتہائی مسرت ہوئی۔ خوابیدہ جذبے بیدار ہو گئے۔ تم نے صحیح لکھا ہے۔ میں ملازمت کر رہی ہوں۔ جہاں تک شادی کا سوال ہے تو میری شادی نہیں ہوئی۔ عورت زندگی میں کسی کو ایک بار چاہتی ہے۔ ہم لوگ اتنے قریب ہو گئے تھے کہ اب کوئی جچتا ہی نہیں۔ چھوڑو ان قصوں کو۔ تم برابر خط لکھتے رہو۔ چاچا اور چاچی کو میری طرف سے اور میرے والدین کی جانب سے سلام کہہ دینا۔

تمہاری نیلو

....

جب ہارون کو خط ملا تو اس کے دل میں ایک انجانی خوشی نے ہلچل مچادی۔ وہ گھنٹوں نیلوفر کے بارے میں مختلف زاویے سے سوچتا رہا۔ جب محی الدین صاحب کو خبر ہوئی کہ ڈھاکا سے خط آیا ہے تو انہوں نے ہارون سے پوچھا۔

''ڈھاکا سے کس کا خط آیا ہے بیٹا؟''

''پاپا نیلو کا خط آیا ہے۔'' ہارون نے کہا۔

''کیا لکھا ہے نیلوفر نے؟'' محی الدین نے ہارون سے پوچھا۔

''آپ خود ہی پڑھ لیں۔'' ہارون نے خط دیتے ہوئے پوچھا۔

خط پڑھنے کے بعد محی الدین سوچ میں پڑ گئے۔ رات کو کھانے کے بعد انہوں نے اپنی بیگم سے کہا۔

''لگتا ہے ہارون اور نیلوفر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

''میں تو ڈھاکا ہی سے جانتی ہوں مگر حالات نے ساتھ نہ دیا اور دونوں معصوموں کی آرزو پامال ہو کر رہ گئی۔'' بیگم محی الدین نے کہا۔

''اب تو آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔ اگر بھائی شرافت راضی ہو جائیں تو ابھی بھی بات بن سکتی ہے۔'' محی الدین نے کہا۔

''کوشش کر کے دیکھیں۔'' بیگم بولیں۔

دوسرے دن محی الدین نے ہارون کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور کہا۔

''بیٹا میں جو کچھ پوچھوں اس کا تم صحیح اور صاف جواب دینا۔''

''پوچھیے، کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں۔'' ہارون نے کہا۔

''تم نیلوفر کو پسند کرتے ہو؟ کیا تم اس سے شادی کے لئے تیار ہو؟''

پاپا ہم لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن حالات نے مجبور کر دیا۔'' ہارون نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' محی الدین نے کہا۔

بیگم سے مشورے کے بعد محی الدین نے شرافت حسین کو خط لکھا اور ہارون سے نیلوفر کے رشتے کی پیشکش کی۔

خط پڑھتے ہی شرافت حسین عجب کشمکش میں پڑ گئے۔ بیگم سے رائے طلب کی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دو ملک، دو قوم کا سوال ہے۔'' بیگم نے کہا۔

شرافت حسین نے بیگم کی بات سنی اور خاموش ہو گئے۔ شام کو نیلوفر جب گھر آئی تو شرافت حسین نے کہا۔

''کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میرے پاس آجانا۔ تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد نیلوفر باپ کے پاس پہنچ گئی۔

''پاپا میں آگئی۔''

شرافت حسین نے محی الدین کا خط دیتے ہوئے کہا۔

''نیلو! خط پڑھ کر مجھے بلا جھجک اپنی رائے سے مطلع کرو۔''

''بابا، ہارون کے آسی بھالو باشی (یعنی میں ہارون کو بہت پسند کرتی ہوں)۔'' نیلوفر نے کہا۔

شرافت حسین کو پاکستان کے ٹوٹنے کا بہت غم تھا۔ وہ ہندوستان کی بالادستی کے خلاف تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد افراتفری، بے راہ روی اور بدامنی کو دیکھ کر وہ خون کے آنسو روتے۔ وہ وہاں کی صورت حالات سے بہت بیزار تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے بنگلہ دیش چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور بیگم سے کہا۔

''نیلوفر کا رشتہ ہارون سے کر دیتے ہیں اور بھائی محی الدین کو جواب دے دیتے ہیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' بیگم نے کہا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ ہم لوگ پاسپورٹ بنوا کر کراچی چلے جائیں گے اور یہ نیک کام انجام دینے کے بعد امریکہ بیٹے کے پاس چلے جائیں گے۔''

بیگم خاموش ہوگئیں۔ دونوں کئی دن تک اس معاملے پر مختلف زاویے سے غور کرتے رہے۔ بیٹی کے جذبات کو سامنے رکھا، پھر امریکہ جا کر بیٹے کے ساتھ رہنے کے ارادے کو بھی سامنے رکھا اور بنگلہ دیش کے ماضی و مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے بیگم نے شوہر کے خیالات سے اتفاق کرلیا۔

شرافت حسین نے محی الدین کو اثبات میں جواب دے کر اپنے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ اپنے مکان کو فروخت کیا۔ پاسپورٹ بنوائے، ویزا حاصل کیا۔ سارے وسائل سمیٹ کر کراچی کے لئے یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے کہ وہ بیٹے کے پاس امریکہ جا رہے ہیں۔

شرافت حسین نے کراچی پہنچ کر محی الدین کے بھائی کے گھر قیام کیا جس کا پہلے سے ہی انتظام کر دیا گیا تھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور زور و شور سے شادی کی تیاری میں محی الدین اور

شرافت حسین کی بیگمات لگ گئیں۔ خدا کے فضل و کرم سے بخیر و خوبی شادی انجام پا گئی اور اس طرح دو بچھڑے ہوئے دوست پھر شیر و شکر ہو گئے۔ ان کے بچوں نے بھی اپنی مرادیں حاصل کر لیں۔

''بھائی محی الدین جس طرح ہم لوگوں نے رشتے کی کڑی جوڑی ہے، اسی طرح اور لوگ بھی کڑیاں جوڑ کر رشتے کی زنجیر بنائیں تو کوئی مشکل نہیں کہ دونوں ملک آپس میں ہم آہنگ نہ ہو سکیں۔'' شرافت حسین نے کہا۔

محی الدین کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

اَنا کی بھینٹ

عثمان احمد ایک سیاسی آدمی تھے۔ ان کا اپنا کاروبار تھا۔ وہ ایک خوش وخرم زندگی گزار رہے تھے۔ الیکشن میں خود کھڑے نہیں ہوتے لیکن جس کا ساتھ دیتے وہ اسمبلی تک پہنچ جاتا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام ہمایوں اور دوسرے کا نام اکبر۔ ہمایوں ایم بی اے کر لینے کے بعد اپنے باپ کے کاروبار میں لگا ہوا تھا۔ اکبر کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک غیر ملکی بینک میں بڑے عہدے پر فائز تھا۔ ہمایوں کی شادی اپنے چچا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اکبر کی شادی اس لئے نہ ہوسکی کہ اس کے معیار پر کوئی لڑکی اترتی ہی نہ تھی۔ جس لڑکی سے منسوب آتی اور دیکھ بھال کا سلسلہ چلتا تو اکبر یہ کہہ کر مسترد کر دیتا کہ لڑکی اس کے معیار کی نہیں ہے۔ وہ مختلف لڑکیوں سے دوستی کرتا اور شادی کی بات آتی تو وہ یہ کہہ کر نامنظور کر دیتا کہ اس کی ذہنی سطح سے وہ بہت نیچے ہے۔ اگر شادی ہو بھی گئی تو نباہ مشکل ہوگی۔

انہیں چکروں میں اکبر کی عمر بھی خاصی ہوگئی۔ ایک دن ایک کانفرنس میں اکبر کے والد عثمان صاحب اپنی بیگم کے ساتھ شریک تھے کہ وہاں ان کی ملاقات بیگم ترمذی سے ہوئی۔ ترمذی صاحب تھے تو پاکستانی لیکن امریکی شہریت انہیں ملی ہوئی تھی۔ وہ وہیں رہتے تھے اور کاروبار بھی ان کا امریکہ ہی میں تھا۔ پاکستان صرف اپنی بیٹی کی شادی کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی کسی پاکستانی لڑکے سے کرنا چاہتے تھے۔

دورانِ گفتگو بیگم عثمان کو ترمذی صاحب اور ان کی بیگم کے پاکستان آنے کا مقصد معلوم ہوگیا۔ اتفاق سے اس کانفرنس میں ترمذی صاحب کی لڑکی صندل بھی آئی ہوئی تھی۔ بیگم عثمان نے

ایک ہی نظر میں صندل کو پسند کرلیا۔ انہوں نے بیگم ترمذی سے اس سلسلہ میں بات کرنی چاہی لیکن انہوں نے کہا کہ آپ لوگ کسی دن غریب خانے پر تشریف لائیں تو باتیں ہوں گی۔

دو تین دنوں بعد عثمان صاحب مع بیگم ترمذی صاحب کے یہاں گئے۔ بہت ساری رسمی گفتگو کے بعد بیگم عثمان نے صندل کا رشتہ اپنے بیٹے اکبر کے لئے مانگا۔ ترمذی صاحب بہت فراخ دل اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ انہوں نے کہا۔

''بھائی صاحب، رشتہ اس طرح ہوتا ہے؟ ہم لوگ پہلے ایک دوسرے کو سمجھ لیں۔ پھر بچوں کی پسند اور ناپسند کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ بچے بھی راضی ہوں تب رشتہ استوار کیا جانا چاہئے۔ آپ کسی دن اکبر کو یہاں لے کر آئیں اور ساتھ ہی اپنا نسب نامہ بھی۔ میں بھی اپنا شجرہ آپ کے ملاحظہ کے لئے تیار رکھوں گا۔ کوئی حتمی بات کرنے سے پہلے ایک دوسرے کے منظر اور پس منظر کو بخوبی جان لینا چاہئے۔''

حسبِ پروگرام دونوں نے اپنا اپنا سوانحی خاکہ ایک دوسرے سے تبدیل کیا۔ اکبر بھی والدین کے ہمراہ موجود تھا۔ کھانے کی میز پر سب لوگ بیٹھے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ گفتگو ہوتی رہی اور ایک دوسرے کو پرکھنے کی کوشش بھی ہوتی رہی۔ عثمان صاحب اور ان کی بیگم کو صندل بہت پسند آئی۔ گھر جا کر انہوں نے اکبر سے استفسار کیا۔

''پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ صندل صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں، صورت شکل کی بھی حسین ہے اور بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ میری طرف سے O.K. ہے۔ آپ لوگ بات آگے بڑھائیں۔''

چند دنوں بعد عثمان صاحب نے ترمذی صاحب کو مع بیگم اور صندل کے کھانے پر مدعو کیا۔ طے شدہ پروگرام کے تحت دونوں خاندان باہم گفتگو کرتے رہے اور آخر میں بیگم عثمان نے بیگم ترمذی سے کہا۔

''ہم لوگ آپ کے عندیہ کے انتظار میں ہیں۔''

''جلد ہی کسی فیصلے پر پہنچ کر آپ لوگوں کو مطلع کردوں گی۔'' بیگم ترمذی نے جواب دیا۔

ترمذی صاحب جب دعوت سے گھر لوٹے تو اپنی بیگم اور بیٹی سے مشورہ کیا۔ فیصلہ ہوا

کہ یہ رشتہ منظور کرلیا جائے۔ چنانچہ ترمذی صاحب نے عثمان صاحب کو ٹیلی فون پر بتایا کہ آپ لوگ تشریف لے آئیے، آپ لوگوں کی پیشکش پر مزید گفتگو ہوگی اور ضروری تفصیلات بھی طے کرلی جائیں گی۔ عثمان صاحب یہ سن کر بے حد خوش ہوئے۔ فوراً بیگم اور اکبر کو بتایا۔ ان لوگوں کو بھی مسرت ہوئی۔

طے شدہ وقت کے مطابق عثمان صاحب اور ان کی بیگم ترمذی صاحب کی رہائش گاہ پہنچے اور کافی دیر کی گفتگو کے بعد تمام تفصیلات طے کرلیں۔ چونکہ ترمذی صاحب کو امریکہ واپس جانا تھا اس لئے وہ نزدیک کی کوئی تاریخ مقرر کرنا چاہتے تھے۔ عثمان صاحب نے کہا۔

''اکبر سے مشورہ کر کے کوئی نزدیک کی تاریخ طے کرلیتے ہیں۔''

عثمان صاحب اور ان کی بیگم نے اکبر کو بتایا کہ وہ رشتہ طے کر کے آگئے ہیں۔

''اب تم بتاؤ کہ اس ماہ کی کون سی تاریخ مقرر کی جائے۔ ان لوگوں کو امریکہ واپس جانا ہے اس لئے وہ زیادہ تاخیر کرنا نہیں چاہتے۔''

''پاپا، یہ زندگی کا سودا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تاریخ کے تعین سے قبل ایک مرتبہ صندل سے تنہائی میں تبادلۂ خیال ہوجائے پھر حتمی فیصلہ ہو۔''

''تم نے تو اپنی رضامندی ہم لوگوں پر ظاہر کردی تھی، جب ہی تو ہم لوگ سب کچھ طے کر کے آگئے۔ اب صرف تاریخ بتانا باقی ہے۔ تم ایک نئی بات کر کے ہم لوگوں کی پوزیشن خراب کررہے ہو۔''

''اس میں پوزیشن خراب ہونے کی کیا بات ہے پاپا۔ ہر طرح سے تسلی کرلینا ان کے حق میں بھی اچھا ہے۔''

مجبوراً بیگم عثمان کو بیگم ترمذی سے بات کرنی پڑی۔ انہوں نے اکبر کی خواہش کا اظہار کیا اور جواب کی ملتجی ہوئیں۔ بیگم ترمذی نے کہا کہ وہ ترمذی صاحب سے مشورہ کر کے بتائیں گی۔

کھانے کی میز پر بیگم ترمذی نے بیگم عثمان کی خواہش ترمذی صاحب کو بتائی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے۔

''یہ شرط ممکن نہیں۔ ہر چند ہم لوگ امریکہ میں رہتے ہیں اور بہت کھلے ذہن کے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر جائز اور ناجائز باتیں مان لی جائیں۔ اکبر نے صندل کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ باہم تبادلۂ خیال بھی کیا ہے۔ اب تنہائی میں کیا گفتگو کرنا چاہتا ہے۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ترمذی صاحب نے پھر کہا۔''بات یہیں ختم کریں بیگم۔ ہم لوگ کوئی مجبور نہیں ہیں۔ کوئی اور رشتہ ڈھونڈ لیں گے۔''

''نہیں پاپا، ایسے لوگوں کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔'' صندل بول اٹھی۔'' آپ اکبر کو بلا لیں، میں اس سے گفتگو کرنے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ترمذی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' ان لوگوں کو آئندہ اتوار کو شام کی چائے پر بلا لو۔''

طے شدہ پروگرام کے مطابق عثمان صاحب مع بیگم اور اکبر کے آئے۔ چائے نوشی کے بعد ترمذی صاحب نے کہا۔

''صندل، تم اور اکبر باتیں کرو۔ ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر کچھ باتیں کریں گے۔''

اب وہاں صرف صندل اور اکبر رہ گئے۔ دونوں میں مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتے رہے۔ گفتگو کے ہر موضوع پر صندل کا پلہ بھاری رہا۔ کچھ دیر بعد سب لوگ اکٹھے ہوئے، کچھ دیر باتیں ہوئیں اور عثمان صاحب اور ان کی بیگم اور اکبر رخصت ہو گئے۔

اکبر نے گھر جا کر بتایا کہ مجھے صندل بہت پسند ہے، بہت ذہین ہے۔ آپ لوگ جلد از جلد تاریخ طے کر لیں، مزید دیر نہ کریں۔ ادھر صندل نے کہا:

''پاپا، یہ لوگ تنگ ذہن ہیں۔ ان لوگوں سے رشتہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔''

''میں تو یہ سمجھ ہی رہا تھا اسی لئے میں نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ رشتہ منظور کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن تم نے ہی روک دیا تھا۔''

''پاپا میں انہیں اس طرح جواب دینا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ انہیں سبق بھی ملنا چاہئے۔ اب آپ ان سے کہہ دیں کہ اکبر سے گفتگو کے بعد صندل اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اکبر کی ذہنی سطح صندل کی

ذہنی سطح سے بہت نیچے ہے۔اس لئے صندل کو اکبر کا رشتہ منظور نہیں۔اس رشتے کو حتمی طور پر منقطع سمجھا جائے اور اس سلسلے یں مزید کوئی گفتگو نہ کی جائے۔"

صندل کی رائے سے بیگم عثمان کو آگاہ کر دیا گیا۔یہ خبر وہاں پہنچتے ہی گویا بجلی گر پڑی۔ اکبر کی انا کی دیوار مسمار ہو گئی۔اس کو ایسا لگا کہ کسی نے اسے دو منزلہ عمارت کی چھت سے نیچے پھینک دیا ہے۔اس نے کتنی ہی لڑکیوں کو ہیچ سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا لیکن آج اسے ایک لڑکی نے ٹھکرا دیا۔اکبر حساس بہت تھا وہ اسے اپنے بے عزتی سمجھنے لگا۔کھانا پینا چھوڑ دیا اور بیمار پڑ گیا۔ڈاکٹر نے اسے صدمے کا اثر بتایا۔اسے مسکن دوائیں دی جانے لگیں۔اور آرام کرنے کے لئے کمرے میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔

ماں کے جانے کے بعد اکبر پر جنونی کیفیت طاری ہوئی اور وہ اٹھ کر شیشی کی تمام گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لئے سو گیا۔صبح کو عثمان صاحب کے گھر پر کہرام مچ گیا لیکن صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔تعزیت کے لئے جو بھی آتا، اس سے عثمان صاحب بڑے ہی دکھ بھرے انداز میں کہتے:

"اکبر اپنی انا کی بھینٹ چڑھ گیا، اکبر اپنی انا کی بھینٹ چڑھ گیا۔"

☆☆☆

انتظار

عرفان احمد کسٹم میں سینئر سپر نٹنڈنٹ تھے۔ ان کے دو بیٹے سلطان احمد اور برہان احمد تھے۔ سلطان احمد برہان احمد سے تقریباً آٹھ سال بڑا تھا۔ سلطان ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ایک مشہور کمپنی میں منیجر تھا، برہان احمد بھی ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ملازمت کی تلاش بھی جاری تھی۔ سلطان احمد کی شادی ہو چکی تھی۔ عرفان احمد کا یہ چھوٹا سا کنبہ خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ دونوں بھائی گھر پر ہی تھے۔ سلطان احمد کو کہیں ٹیلی فون کرنا تھا۔ وہ جب ٹی وی لاؤنج میں آئے تو دیکھا کہ برہان ٹیلی فون پر کہیں بات کر رہا ہے۔ سلطان واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئے تو دیکھا کہ برہان اب تک محو گفتگو ہے۔ اسی طرح کئی بار آئے لیکن انہیں برہان ٹیلی فون پر مشغول ملا۔ سلطان کے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور سیدھا اپنی ماں کے پاس گیا اور شکایت کی کہ برہان آدھے گھنٹے سے ٹیلی فون کو مصروف رکھے ہوئے ہے اور اسے ایک ضروری ٹیلی فون کرنا ہے۔ ماں نے بیٹے کا تیور دیکھا تو فوراً برہان کے پاس پہنچی اور اسے آہستہ سے ٹیلی فون کو فارغ کرنے کو کہا۔ برہان نے ماں کا اشارہ پاتے ہی ریسیور رکھ دیا۔

ماں نے سلطان سے کہا جاؤ ٹیلی فون خالی ہے۔ سلطان غصے کے عالم میں ٹیلی فون کرنے کی بجائے برہان پر برس پڑا۔

''ہر وقت تم ٹیلی فون پر لگے رہتے ہو۔ تمہیں اس کا خیال نہیں کہ ٹیلی فون کرنے کی ضرورت کسی اور

کو بھی پڑ سکتی ہے۔ بل میں ہر ماہ اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ تمہیں بل ادا کرنا پڑے تو احساس ہو۔''

''بھائی اتنا برہم ہونے کی کیا بات ہے۔'' برہان نے کہا۔ ''صرف میں ہی تو ٹیلی فون استعمال نہیں کرتا۔ آپ کرتے ہیں، بھابی بھی کرتی ہیں۔ حسب ضرورت آدمی ٹیلی فون تو کرتا ہی ہے۔ والد مرحوم زندہ تھے تو بل وہ ادا کرتے تھے، اب گھر کا انتظام آپ کے ذمہ ہے تو بل آپ ادا کرتے ہیں۔ کل مجھے ملازمت مل جائے گی تو میں بھی گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹاؤں گا۔''

''تم نادم ہونے کی بجائے زبان درازی کرنے لگے ہو۔'' سلطان کا غصہ اب بھی برقرار تھا۔

''آپ غلط سمجھے۔ میں تو آپ کی برہمی پر اپنی صفائی پیش کر رہا ہوں۔''

سلطان کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ اس نے برہان کو بہت ہی ترش لہجے میں کہا۔ ''اپنی بکواس بند کرو۔ مجھے نہیں چاہئے کوئی صفائی۔''

اس نوک جھوک کی آواز ماں کے کانوں تک پہنچی تو وہ فوراً وہاں پہنچی اور دریافت کیا۔

''کس بات پر الجھ رہے ہو تم دونوں، کیا ہوا تم لوگوں کو؟''

سلطان احمد نے کہا۔ ''یہ میرے ٹکڑوں پر پلنے والا مجھے ہی قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ سمجھائیں اپنے لاڈلے کو۔ اگر اس کا یہی رویہ رہا تو میرے ساتھ گزر نہیں ہو سکے گی اس کی۔''

''تم ہوش میں تو ہو۔'' ماں نے سلطان سے کہا۔ ''تم شاید سمجھ نہیں رہے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ سال بھر پہلے تک سارا انتظام تمہارے باپ کے ذمہ تھا۔ ان کی وفات کے بعد ذمہ داری تمہارے سر پر آن پڑی۔ بھائی سے یہ کہنا کہ وہ تمہارے ٹکڑوں پر پل رہا ہے کس حد تک درست ہے؟ تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ آج بھی تمہارے باپ کے پیسے کے علاوہ پنشن کی جو رقم آتی ہے اسے بھی میں گھر کے اخراجات میں استعمال کرتی ہوں۔ تمہیں یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی کہ گھر کے سارے اخراجات تمہارے ذمے ہیں۔ تم چاہو تو اپنا انتظام الگ کر لو، میں برہان کی کفالت کر لوں گی۔''

سلطان ماں کی باتوں سے بہت شرمندہ ہوا۔ ''امی گھر جیسے چل رہا ہے ویسے ہی چلنے دیں۔ میں

معذرت خواہ ہوں۔آپ مجھے معاف کردیں۔''

ماں خاموش ہوگئیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ان کے جانے کے بعد سلطان اور برہان بھی اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

رات کے وقت کھانے کی میز پر گھر والے جمع ہوئے تو ان میں برہان نہیں تھا۔ برہان کی والدہ نے بوا سے دریافت کیا تو بوا نے بتایا کہ چھوٹے میاں کھانا نہیں کھائیں گے، ان کی طبیعت خراب ہے۔ ماں فوراً اٹھیں اور برہان کے کمرے میں جا کر اسے کھانے کے لئے چلنے کو کہا۔ برہان نے کہا۔

''نہیں امی، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

''تمہیں بڑے بھائی کی باتیں بری لگی ہیں نا؟ بڑا بھائی اگر کچھ کہہ دے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تم کھانا چھوڑ دو۔ میں نے تمہاری موجودگی میں اس کی خبر لی ہے۔ بڑے بھائی کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ چلو، اٹھو۔'' ماں نے سمجھاتے ہوئے اصرار کیا۔

''میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا امی، آپ ضد نہ کریں، مجھے آرام کرنے دیں۔''

ماں ''اس وقت'' کو ذہن میں رکھتے ہوئے چلی گئیں۔ ماں کے واپس جانے کے بعد برہان کی بھابی اس کے پاس گئیں اور کہا۔

''بھائی تم نے بڑے بھائی کی باتوں کا برا مان لیا؟ غصہ تھوک دو اور چلو ساتھ کھانا کھائیں۔ تمہارے بغیر ہمیں کھانا کھاتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا۔''

''آپ اصرار نہ کریں بھابی۔ میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' برہان نے جواب دیا۔

بھابی نے واپس آکر اپنے شوہر سے کہا۔ ''آپ جائیں، وہ آپ کی باتوں سے رنجیدہ ہوا ہے۔''

''اس وقت جانا درست نہیں ہوگا۔'' سلطان نے کہا۔ ''وہ اس وقت غصے میں ہے۔ اگر جاؤں گا تو ہوسکتا ہے بات اور بڑھ جائے۔''

ماں نے بھی سلطان کی تائید کی۔

''کل تک وہ نارمل ہو جائے گا تو معذرت کرلوں گا۔'' سلطان نے کہا۔

دوسرے دن سلطان احمد نے حسب معمول ناشتہ کیا اور دفتر چلے گئے۔ برہان احمد جب نو بجے تک ناشتے کے لئے نہ آئے تو ماں اس کو دیکھنے گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ماں نے دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ انہوں نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ اندر سے کھلا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو برہان کا بستر خالی ملا۔ ماں نے سمجھا بغیر ناشتہ کئے باہر چلا گیا ہے۔ برہان روزانہ تین بجے تک گھر واپس آجاتا تھا لیکن جب وہ تین بجے تک نہیں آیا تو ماں کو تشویش ہوئی اور وہ بے قراری سے گھر کے اندر ٹہلتی رہیں۔ تقریباً ساڑھے تین بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے تیز قدموں سے بڑھ کر ٹیلی فون اٹھالیا۔ برہان ہی کا ٹیلی فون تھا۔

''یہ تم ناشتہ کئے بغیر کہاں چلے گئے اور ابھی تک گھر بھی نہیں لوٹے، بات کیا ہے؟ تم فوراً آؤ میں انتظار کر رہی ہوں۔''

''امی اب میں گھر نہیں آؤں گا۔ زندگی رہی تو شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔ آپ میرے لئے دعا کیجئے اور میری کوتاہیوں کو درگزر کر دیجئے۔ خدا حافظ۔''

ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ماں اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔

برہان کی والدہ کی پریشانی فزوں تر ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ وہ 'بابو، بابو' کی رٹ لگائے رکھتیں۔ سلطان سے ماں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ ماں کو تسلی دیتا کہ برہان کہاں جائے گا، وہ جلد ہی گھر واپس آجائے گا، ابھی وہ اپنی اَنا کے حصار میں ہے۔ جلد یہ حصار ٹوٹ جائے گا اور وہ واپس آجائے گا۔

جب وہ ایک ہفتے تک نہیں لوٹا تو سلطان کو بھی تشویش ہوئی۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا کہ اشتہار دیکھتے ہی فوراً گھر آؤ، ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ لیکن کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ برہان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ سلطان اشتہار پر اشتہار دیتا رہا لیکن سب بیسود۔ ماں کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔

تقریباً چھ ماہ گزر گئے۔ برہان کی کوئی خبر نہ ملی اور ماں کی حالت نازک مرحلے میں پہنچ گئی۔ مجبوراً انہیں اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ وہ نیم بیہوشی کے عالم میں تھیں۔ جب آنکھ کھلتی اور ہوش آتا تو وہی 'بابو، بابو' کی رٹ لگاتیں۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔

یکایک سلطان کے گھر کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھلنے پر معلوم ہوا کہ برہان آ گئے۔ بیگم سلطان نے دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا اور کہا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے۔ تمہارے مفارقت میں امی سخت بیمار ہو گئیں۔ کئی اخباروں میں اشتہار دیا گیا، کیا تمہاری نظروں سے کوئی اخبار نہیں گزرا؟''

''میں اشتہار پڑھتا رہا ہوں بھابی لیکن میں سمجھتا رہا کہ یہ سب بلانے کی ترکیبیں ہیں۔ کیا معلوم تھا کہ امی واقعی بیمار ہیں۔ پرسوں رات کو مجھے خواب میں ایسا لگا کہ امی آوازیں دے رہی ہیں...... بابو، بابو تم کہاں ہو، میں انتظار کر رہی ہوں، جلدی آؤ۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں پھر سو نہیں سکا۔ صبح ہوتے ہی گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔ امی کہاں ہیں بھابی؟''

''امی اسپتال میں ہیں۔'' بھابی نے بتایا۔

برہان الٹے پاؤں اسپتال کے لئے روانہ ہو گیا۔ ماں کے کمرے میں پہنچا تو ماں کو بیہوش پایا۔ قریب پہنچ کر اس نے ماں کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور امی امی کی آواز لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اسے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ خود کو مجرم سمجھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی ماں نے آنکھ کھولی اور پوچھا۔ ''بابو آیا؟''

''میں آ گیا ہوں امی، میں آ گیا ہوں۔'' برہان تڑپ کر بولا۔ ''میں آپ کے پاس ہوں۔''

اس نے اپنا ہاتھ ماں کے ہاتھ میں دے دیا، ماں نے آنکھیں کھول کر بیٹے کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور کہا۔

''بابو تم نے آنے میں بہت دیر لگا دی۔ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔''

ماں نے ہاتھ اٹھا کر برہان کے سر پر رکھا ہی تھا کہ ہاتھ جھول کر رہ گیا۔ طویل انتظار کی گھڑی ختم ہوئی۔

☆☆☆

کھوٹا سکّہ

بنیادی بیگم میری پرانی مریضہ ہیں۔تقریباً تین دہائی سے ان کا اور ان کے گھر والوں کا میں علاج کر رہا ہوں۔ایک دن میرے کلینک میں ایک محترمہ کو لے کر آئیں اور بتایا کہ یہ میری بہو ہیں۔

''کیا تکلیف ہے انہیں؟''میں نے پوچھا۔

''تین سال شادی کو ہو چکے ہیں لیکن اب تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔''بنیادی بیگم نے بتایا۔

''اولاد تو قدرت کی دین ہے لیکن مرد یا عورت میں کوئی خرابی یا کمی ہو تو وہ دوا کے ذریعہ دور کی جا سکتی ہے۔''میں نے کہا۔''اس وقت ان کو کیا تکلیف ہے؟''

''اس وقت ان کو تین شکایات ہیں۔ایک تو یہ موٹی بہت ہو گئی ہیں۔دوسرے ان کے ایام میں گڑ بڑ رہتی ہے۔ہر ماہ نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے تو بہت کم ہوتا ہے۔تیسرے ان کے مزاج میں تیزی بہت ہے۔بات بات پر الجھ پڑتی ہیں۔''

میں نے کہا۔''پہلی شکایت کا تعلق آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے کھانے میں ترمیم کریں۔ چاول، چینی، چکنائی اور آلو سے پرہیز کریں اور جسمانی محنت کریں۔دوسری شکایت کے لئے میں علاج کروں گا، انشاء اللہ یہ شکایت دور ہو جائے گی۔تیسری شکایت کا ازالہ آپ لوگ خود کریں۔ آپ لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی کو خوش گوار بنائیں۔ایسا کوئی موقع ہی نہ آئے کہ کسی کو کسی سے الجھنا پڑے۔''

بنیادی بیگم کی بہو کے لئے دوا تجویز کر دی گئی اور پرہیز وغیرہ سے بھی آگاہ کر دیا گیا۔ دو ماہ کے علاج کے بعد ان کی شکایات دور ہو گئیں۔ موٹاپا بھی کم ہوا۔ ایام کی خرابی بھی دور ہو گئی اور مزاج کی تندی بھی کم ہو گئی۔

''اب علاج کی ضرورت نہیں ہے، دوا بند کر دیں۔'' میں نے انہیں مشورہ دیا۔

بنیادی بیگم مطمئن نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک اولاد نہ ہو وہ کیسے سمجھ لیں کہ ان کی بہو تندرست ہو گئی ہے۔

''دیکھئے، بہو کے اندر جو خرابی تھی وہ تو دور ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے بیٹے کے اندر کوئی کمی ہو۔ اولاد کے لئے مرد اور عورت دونوں کا تندرست ہونا ضروری ہے۔ آپ کے بیٹے کو جانچ کروانا ہوگا۔''

بنیادی بیگم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا بیٹا چشمِ بد دور تندرست ہے۔ کبھی اس کے سر میں درد بھی نہ ہوا۔''

''بظاہر تندرست ہونا اور بات ہے محترمہ۔'' میں نے کہا۔ ''بچہ پیدا ہونے کے لئے مرد کے اندر خاص قسم کے جرثومہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ ان باتوں کو نہیں سمجھیں گی۔ آپ اپنے بیٹے کو میرے پاس بھیج دیں میں اسے سمجھا دوں گا۔''

شاید انہیں میری بات سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے کہا کہ آئندہ اتوار کو وہ بیٹے کو لے کر آ جائیں گی کیونکہ ان کے بیٹے کو اتوار کو فرصت ہوتی ہے۔

حسب وعدہ بڑی بی اپنے بیٹے کو لے کر آئیں۔ میں نے ان سے کچھ دیر باہر بیٹھنے کو کہا۔ وہ باہر چلی گئیں تو میں نے ان کے لڑکے سے دریافت کیا کہ اس کے اندر کوئی جسمانی یا جنسی کمزوری تو نہیں ہے۔ لڑکے نے کہا خدا کے فضل سے کوئی کمزوری نہیں ہے۔

''صحت مند ہوں اور آپ کے سامنے ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اولاد کے لئے صرف اتنا کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک خاص قسم کے جرثومہ کا مرد کے اندر ہونا

ضروری ہے۔ میں لکھ کر دے رہا ہوں، آپ جانچ کروا کر رپورٹ لے کر آئیں پھر میں مشورہ دوں گا۔''

وہ بڑی مشکل سے جانچ کروانے پر آمادہ ہوا۔ میں نے پرچی لکھ کر دے دی۔
چند دنوں بعد بنیادی بیگم آئیں اور کہا۔ ''لڑکا تو نہیں آسکا۔ جانچ کی رپورٹ لے کر مجھے بھیجا ہے۔ آپ سے دوا مانگی ہے، دوا دے دیں۔''

میرا خیال درست نکلا۔ اس رپورٹ میں جرثومہ صفر تھا۔
''آپ تو فرمارہی تھیں کہ لڑکے میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن جانچ کے مطابق آپ کے لڑکے میں جرثومے کی کمی ہے۔ گھبرایئے نہیں، علاج سے امید ہے کہ جو کمی ہے وہ انشاءاللہ دور ہو جائے گی۔ اب آپ بہو کو برا بھلا نہ کہیے گا۔''
بنیادی بیگم نے کہا۔'' بہو کی طرف سے میری بدگمانی دور ہوگئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا ہی سکہ کھوٹا ہے!''

لے پالک

طلعت حسین مقامی بینک میں ملازم تھے۔ ان کی شادی اپنی خالہ کی بیٹی محمودہ سے ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی کی مثالی ازدواجی زندگی تھی۔ دونوں کی زندگی بہت ہی خوشگوار گزر رہی تھی لیکن شادی کے پانچ سال تک جب اولاد نہیں ہوئی تو دونوں ڈاکٹر سے رجوع ہوئے۔ ڈاکٹر نے مختلف جانچ اور معائنہ کے بعد بتایا کہ بچہ ہونے کی توقع نہیں ہے اس لئے کہ جس جرثومہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ موجود نہیں ہے۔

طلعت حسین نے بیگم سے کہا۔ ''اگر آپ تیار ہوں تو Tube Baby کا انتظام کریں۔''

بیگم نے کہا۔ ''میں اس غلط اقدام کے لئے تیار نہیں ہوں۔''

بچے کی خواہش دونوں کو تھی۔ خیال آیا خاندان میں کسی سے کہہ کر کوئی بچہ گود لے لیا جائے۔ لیکن بیگم نے یہ خیال بھی مسترد کر دیا کہ خاندان میں کسی سے بیٹا یا بیٹی گود لینا مناسب نہیں رہے گا، کچھ نہ کچھ دخل اندازی ہوتی ہی رہے گی اس لئے بہتر ہوگا کہ کوئی لاوارث بچہ لے کر پالا جائے اور اپنی اولاد کی جگہ اسے ہی اولاد سمجھا جائے۔ طلعت حسین نے بیگم کی رائے سے متفق ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ کسی یتیم خانے سے ایسے بچے کو گود لیا جائے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

دونوں ایک مقامی یتیم خانے گئے اور کئی بچوں کو دیکھنے کے بعد ایک ایسی شیر خوار بچی کا انتخاب کیا جو کسی اسپتال سے لاوارث یتیم خانے لائی گئی تھی۔ طلعت حسین اور ان کی بیگم ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لڑکی کو گھر لے آئے اور اس کا نام نعمت آرا رکھا۔ ایک تجربہ کار آیا کا

بندوبست کیا گیا کہ اس کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ دونوں میاں بیوی کے لئے نعمت کی صورت میں کھلونا ہاتھ آ گیا تھا۔ ہمہ وقت اسی کی باتیں ہوتیں۔

وقت گزرتا گیا اور نعمت آرا پڑھ لکھ کر جوان ہوگئی۔ اب طلعت حسین اور ان کی بیگم کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ رشتے آتے رہے، باتیں چلتی رہیں۔ آخر صلاح الدین ایڈووکیٹ کے لڑکے صباح الدین سے شادی طے ہوگئی۔ لڑکا پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا۔ ساری تفصیلات کے ساتھ ساتھ شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔ سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔

شادی کے دو دن قبل لڑکے والوں نے تجویز رکھی کہ خاندانی روایت کے مطابق نکاح ایک دن قبل کسی مسجد میں ہو جائے۔ طلعت حسین راضی ہوگئے اور حسب پروگرام وہ مسجد پہنچ گئے۔ نکاح نامہ لکھا جانے لگا۔ نکاح خواں نے جب نعمت آرا کے باپ کا نام پوچھا تو طلعت حسین نے کہا، سمجھئے یہ میری بیٹی ہے، آپ میرا نام لکھ لیں۔ نکاح خواں مولانا خفا ہو کر کہنے لگے۔

''یہ نکاح نامہ بھرا جا رہا ہے۔ اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔ کیا یہ آپ کی بیٹی نہیں ہے؟''

طلعت حسین نے کہا۔ ''یہ میری لے پالک ہے۔ اس کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں، میں نے اسے لاوارث سمجھ کر پالا ہے۔''

''جب اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں تو کیا معلوم اولاد جائز ہے یا ناجائز ہے۔ میں اس میں خود کو آلودہ نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر مولانا چلے گئے۔

جب یہ واقعہ صلاح الدین نے سنا تو غصہ میں آ گئے اور کہنے لگے۔

''میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں نے تو طلعت حسین کی بیٹی سمجھ کر رشتہ کیا تھا۔ اب یہ شادی نہیں ہوگی۔'' طلعت حسین سے کچھ کہے سنے بغیر، وہ لڑکے اور دیگر احباب کو لے کر چلے گئے۔

طلعت حسین صدمے سے چور گھر لوٹے اور چپ چاپ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

بیگم فوراً آئیں اور پوچھا کہ کیا ہوا۔

''ہم لوگ انتظار ہی کر رہے ہیں، لڑکی سے اجازت لینے کوئی آیا ہی نہیں۔''

''بات ختم ہوگئی۔'' طلعت حسین نے کہا۔ ''تفصیل بعد میں بتاؤں گا، ابھی مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد طلعت حسین اٹھے اور اخبار کے ذریعہ شادی کی منسوخی کی اطلاع دینے اخبار کے دفتر چلے گئے۔ وہاں سے واپس آکر اپنے کمرے میں خاموش لیٹ گئے۔ دوسرے دن ساری تفصیل بیگم کو بتائی۔ بیگم پریشان تھیں کہ اب کیا ہوگا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ فی الحال خاموش رہنا بہتر ہے۔'' طلعت حسین نے بیگم کو تسلی دی۔

بات پھیلتی ہوئی نعمت آرا تک پہنچی۔ وہ ایک پڑھی لکھی باشعور اور ذہین لڑکی تھی۔ وہ طلعت حسین کے پاس آئی اور کہا۔

''پاپا، آپ افسردہ کیوں ہیں۔ جوڑے تو آسمان پر لکھے جاتے ہیں۔ صباح الدین سے میرا جوڑا نہیں تھا اس لئے رخنہ پڑ گیا۔ آپ حوصلہ رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بیٹی کی حوصلہ افزا گفتگو سن کر طلعت حسین کا غم کچھ ہلکا ہوا اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت معمول پر آگئی۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگے کہ واقعی میری بیٹی بہت ذہین اور باہمت ہے۔

نعمت آرا واقعی بہت کھلے دماغ کی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی دانشمندی کو بروئے کار لاتے ہوئے پوری روداد لکھ کر ایک اخبار کو بھیجا اور اس مسئلہ کا حل طلب کیا۔ جواب آیا۔

''جو شخص 'لے پالک' کے ساتھ اپنی ولدیت لگا کر نکاح پڑھوائے گا وہ شادی ناجائز ہوگی اور وہ شخص گناہ کا مرتکب ہوگا۔ پرورش کرنے سے کوئی باپ نہیں بن جاتا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہئے۔ نکاح کے وقت نکاح نامہ میں ولدیت کے خانے میں لکھنا چاہئے 'نامعلوم'۔ اور دواوین میں لکھا جائے 'لے پالک فلاں'۔

مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔

☆☆☆

منطق

اشفاق احمد وکیل کے تین بیٹے تھے۔ اسحاق احمد، مشتاق احمد اور اشتیاق احمد۔ بڑا بیٹا اسحاق احمد بھی وکالت کے پیشے سے منسلک تھا۔ مشتاق اور اشتیاق دونوں اپنا اپنا کاروبار کرتے تھے۔ اشفاق احمد کی ذات سے مرکزیت قائم تھی۔ پورا خاندان مشترکہ طور پر رہتا تھا۔ یہ گھرانا بڑا خوش باش گھرانا شمار ہوتا تھا۔ پورے خاندان کی زندگی خیر و عافیت سے گزر رہی تھی۔

اسحاق احمد بحیثیت وکیل بہت کامیاب جارہے تھے اور اپنے والد کی طرح ان کا شمار بھی اچھے وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ اسحاق احمد اپنے پورے شباب پر تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کا اکلوتا بیٹا دانیال یتیم ہوگیا۔ چونکہ یہ متحد خاندان تھا، پورے گھر کا انتظام مرکزی طور پر اشفاق صاحب کے ذمہ تھا اس لئے روزمرہ کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہ پڑا سوائے اس کے کہ دانیال کے تعلیمی اور دیگر اخراجات دادا نے اپنے ذمہ لے لیا۔ کاروانِ حیات پورے خاندان کا بدستور چلتا رہا۔ لیکن اسحاق احمد کو انتقال ہوئے ابھی ایک ہی سال ہوا تھا کہ اشفاق صاحب بھی یرقان میں مبتلا ہوکر صرف تین ہفتہ میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

اب یہ متحد خاندان تین حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ مشتاق اور اشتیاق نے اپنا اپنا انتظام الگ کرلیا اور مجبوراً اسحاق احمد کی بیوہ کو بھی اپنا انتظام الگ کرنا پڑا لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے سبب ان کا کارخانہ چلنا ممکن نہ ہوگا۔ اسی خیال سے بیگم اسحاق نے اپنی ساس سے کہا۔

''اماں دانیال کے حصے کی جائداد اگر الگ کردی جائے تو ہم اپنی گزر بسر کرلیں گے۔ میری تو کوئی مستقل آمدنی ہے نہیں، اس لئے دانیال کی پڑھائی، کھانا اور کپڑوں کے اخراجات کہاں سے

پورے ہوں گے۔''

بیگم اشفاق نے اپنی بیوہ بہو کی تجویز کو اپنے دونوں لڑکوں کے سامنے رکھی اور کہا۔''وکیل کو بلوا کر جائداد تین حصوں میں تقسیم کروا کر دانیال کو اس کا حصہ دے دو۔''

دونوں لڑکوں نے کہا۔''بھائی جان کا انتقال ابا کے انتقال سے پہلے ہو گیا تھا اس لئے دانیال جائداد کا حقدار نہیں ہے۔''

''پھر تمہاری بھاوج کا کارخانہ کیسے چلے گا۔'' ماں نے پوچھا۔

''ہم لوگ ہر ماہ اس وقت تک بھابی کو ایک ایک ہزار دے دیا کریں گے جب تک دانیال کسی کام کا نہیں ہو جاتا۔'' دونوں بھائیوں نے کہا۔

بیگم اشفاق احمد نے اپنے دونوں بیٹوں کے موقف اور تجویز کو اپنی بہو کے سامنے رکھ دیا۔ بیگم اسحاق نے ساس کی باتیں سن کر غور کرتے ہوئے کہا۔

''جب مجھے یا میرے بیٹے کو موروثی جائداد پر کوئی حق نہیں تو ہم اپنے دیوروں کی امداد پر کب تک گزارا کریں گے۔''

''بیٹی میں مجبور ہوں، سب کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتی۔''

بیگم اسحاق نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ گھر چھوڑ کر اپنے آبائی مکان میں بھائی کے پاس جا کر اپنا حق دختری حاصل کرے۔ وہ دانیال کو لے کر چلی گئیں۔ بھائی نے بہت ہی خندہ پیشانی سے بہن کو خوش آمدید کا۔ چند دنوں بعد اس نے سسرال کے سارے واقعات بھائی کو سنائے اور کہا۔

''وہاں تو کوئی حق نہ ملا۔ اب دیکھنا ہے مجھے اپنے والدین کی جائداد سے کچھ ملتا ہے یا نہیں۔''

''تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ تمہارا ۱/۳ حصہ حقِ دختری موجود ہے۔ میں کل ہی وکیل کو بلوا کر کاغذات تیار کرواتا ہوں۔''

''مجھے اب تک تو کوئی ضرورت اس جائداد کی نہ تھی لیکن اب آن پڑی ہے اس لئے مجھے آپ سے کہنا پڑا۔''

''جو تمہارا حق ہے وہ لے لو اور میں جب تک زندہ ہوں تم اور دانیال میری کفالت میں رہو۔ مجھے

بہت خوشی ہوگی۔'' بھائی نے کہا۔

''نہیں بھائی جان، میں اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔ میں اپنے بیٹے کو یتیمی کا احساس نہیں دلانا چاہتی۔ آپ اس گھر میں ایک تہائی حصہ الگ کر دیں، میں اسی میں گزارہ کرلوں گی۔''

''اگر تم الگ ہی رہنا چاہتی ہو تو اس مکان میں چلی جاؤ جو ابھی کرایہ پر دیا ہوا ہے۔ میں اس مکان کو تمہارے حصہ میں وکیل سے کہہ کر لکھوادوں گا۔'' بھائی نے کہا۔

بیگم اسحاق فوراً راضی ہوگئیں کہ اس سے بہتر اور کیا انتظام ہوسکتا تھا۔

مکان خالی کرالیا گیا اور اس میں بیگم اشفاق دانیال کے ساتھ منتقل ہوگئیں۔ وہاں جا کر انہوں نے ایک اسکول کھول لیا اور بچیوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح معقول ماہانہ آمدنی کی صورت پیدا ہوگئی اور گزر بسر سہولت سے ہونے لگی۔ وقت گزرتا گیا اور دانیال انجینئرنگ کالج میں پڑھنے لگا۔ اس دوران نہ دادی نے دانیال کی خبر لی اور نہ ان کے کسی چچا نے۔

قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ عجب تفاق کہ دونوں برادران مشتاق اور اشتیاق مع اپنے بال بچوں کے کسی تقریب میں شرکت کو گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ان لوگوں کی بس کھڈ میں گر گئی اور دونوں بھائی مع اپنے بال بچوں کے اس حادثے کے شکار ہوگئے۔ گھر جب خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا لیکن قدرت کے کارخانے میں کون دخل دے سکتا ہے۔ بیگم اشفاق پر بھرا گھر اجڑ جانے کا گہرا صدمہ ہوا۔ ایک عرصہ تک کھوئی کھوئی رہیں۔ وہ تنہا رہ گئی تھیں۔ گھر اور جائداد کا کوئی وارث نہ رہا۔ اسی عالمِ پریشانی میں انہیں دانیال کا خیال آیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ آئے اور ساری جائداد اور گھر سنبھالے۔ اب تو وہی سب کا واحد وارث ہے۔

بیگم اشفاق اپنی بہو اور پوتے کی تلاش میں بہو کے بھائی نہال احمد کے گھر پہنچیں اور وہاں سے پھر اپنی بہو کے پاس آئیں۔ بہو کو پوری رودادِ غم سنانے کے بعد کہا۔

''بیٹی گھر ویران ہے۔ چلو دانیال کو لے کر۔ اب تو دانیال ہی ساری جائداد کا مالک ہے۔''

بہو نے پوری داستان سن کر بہت افسوس کیا اور کہا۔ ''اماں، کل تک تو میرا دانیال ایک پیسے کا بھی حقدار نہ تھا۔ آج وہ پوری جائداد کا وارث کیسے بن گیا۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' ☆☆

خواب کی تعبیر

تنویر عالم کی محبت کی شادی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے اور مانتے تھے۔ دونوں کی آپس کی محبت مثالی تھی۔ ابتدا میں تو اولاد کی خواہش نہ تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کو اولاد کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔

جب شادی کے پانچ سال تک اولاد نہ ہوئی تو دونوں نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا اور مختلف جانچ کے بعد بتایا کہ دونوں تندرست ہیں اور دونوں میاں بیوی میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ہر لحاظ سے درست ہیں۔ رہا اولاد کا نہ ہونا تو یہ دینے والے کی مرضی پر منحصر ہے۔ دعا فرمائیں، وہ بڑا کارساز ہے۔

اولاد کے نہ ہونے پر کئی بار تنویر کی والدہ نے اصرار کیا کہ دوسری شادی کرلو لیکن تنویر نے ہر مرتبہ ماں کی باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ دوسری بیوی سے اولاد ہو گی۔ کچھ لوگوں کا مشورہ تھا کہ Tube Baby کا انتظام کیا جائے لیکن تنویر اور ان کی بیگم نے اس مشورے کو بھی رد کر دیا کہ یہ شرعی طور پر ناجائز ہے۔ کسی بچے کو گود لینے کا سوال آیا تو دونوں نے اسے بھی رد کر دیا کہ وہ دوسرے کی اولاد کو اپنا نہیں بنانا چاہتے۔

زندگی کی کئی بہاریں ہنسی خوشی گزر گئیں اور میاں بیوی کی رفاقت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک رات بیگم تنویر نے خواب میں دیکھا کہ ایک سرخ گلاب گملے میں کھلا ہوا ہے اور پاس ہی ایک خوبصورت بچہ ہمک ہمک کر ہاتھ پیر چلا رہا ہے۔ بیگم چونک کر اٹھیں اور انہوں نے اس خواب

کو اولاد کے لئے بشارت سمجھا۔ نفسیاتی طور پر ایک انجانی خوشی نے ان کے دل و دماغ کو گدگدایا۔ اس خواب کا ذکر کسی سے نہیں کیا کیونکہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ خواب بیان کرنے سے خواب کی تعبیر بدل جاتی ہے۔

بیگم نے خواب کی تعبیر کے لئے تنویر سے کہا۔ ''آپ مجھے ایک گلاب کا پودا لا دیں۔''

''گھر میں کوئی خالی زمین تو نہیں، وہ پودا کہاں لگے گا؟'' تنویر نے حیرت سے پوچھا۔

''پودا گملے میں لگے گا اور میں اس کی دیکھ بھال کروں گی۔'' بیگم تنویر نے کہا۔ ''یہ فروری کا مہینہ ہے، گلاب کے پودے کے لئے یہ مناسب مہینہ ہے، آپ پودا لے آئیں۔''

بیگم کی فرمائش کے مطابق تنویر ایک گلاب کا پودا مع گملا لے آئے۔ بیگم بہت خوش ہوئیں اور پودے کی دیکھ بھال کا کام حسب وعدہ اپنے ذمے لے لیا۔ گلاب کا پودا بڑھتا رہا اور ادھر بیگم تنویر نے بھی اپنے اندر تبدیلی محسوس کی۔ بیگم نفسیاتی طور پر کسی انجانی خوشی کے خیال سے محظوظ ہوتی رہیں۔ تنویر نے بھی بیگم میں خاصی تبدیلی محسوس کی۔

بیگم تنویر کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ انہیں خواب کی تعبیر مثبت انداز میں حاصل ہوگی۔ ڈاکٹروں نے بھی تصدیق کر دی۔ گھر میں مسرت کی بہار آ گئی۔ ہر شخص وقت کا انتظار کرتا رہا۔

نومبر کے مہینہ کا انتظار شدت سے تھا۔ نومبر کی ایک صبح گلاب کے پودے میں شگوفہ نمودار ہوا اور ساتھ ہی بیگم کا بھی احساس جاگ اٹھا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے، ایک خوبصورت گلاب گملے میں کھلا اور دوسرا بیگم کی گود میں۔ اور اس طرح بیگم کو خواب کی تعبیر مل گئی۔

☆☆☆

جوڑے آسمان پر بنتے ہیں

عرفان صدیقی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کی شادی پروفیسر اے۔ کے۔ فاروقی کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ قدرت نے انہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی عطا کی تھی۔ تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے لڑکا ایم۔ ایس کرنے امریکہ گیا ہوا تھا اور بیٹی نے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد اپنا تعلیمی سفر روک دیا تھا۔ عرفان صدیقی کا گھرانا مہذب اور خوش حال تصور کیا جاتا تھا۔

کاروانِ حیات جادۂ منزل پر رواں دواں تھا کہ عرفان صدیقی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اتنا بڑا حادثہ اس گھر کی ساری خوشیوں کو لوٹ کر لے گیا۔ رفتہ رفتہ دل کا زخم بھرتا گیا اور بیگم صدیقی کی طبیعت معمول پر آتی گئی۔ خدا کا فضل تھا کہ عرفان صدیقی اتنا کچھ کر گئے تھے کہ گھر والوں کو مالی پریشانی نہیں ہوئی۔ رہنے سہنے کا معیار برقرار رہا۔

بیگم صدیقی کو اگر کوئی فکر تھی تو وہ تھی بیٹی کی شادی کی۔ ایک جگہ سے منسوب آئی۔ لڑکا پڑھا لکھا ایک کالج میں لیکچرار تھا۔ لڑکے والوں کو لڑکی اور گھرانہ پسند آیا۔ اب بیگم صدیقی کے ہاں کہنے کی ضرورت تھی۔ بیگم صدیقی نے کہا تھوڑا وقت چاہئے، آپ ہمیں اچھی طرح سمجھ لیں اور ہمیں بھی آپ لوگوں کو جاننے کا موقع ملے۔ لڑکے والے مطمئن ہو گئے اور بیگم صدیقی کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد لڑکے کی ماں کا ٹیلی فون آیا تو بیگم صدیقی نے کہا جلد ہی فیصلہ کر کے مطلع کردوں گی۔

بیگم صدیقی نے اپنے بڑے بھائی کو بلوایا اور انہیں تفصیل بتا کر گزارش کی۔

''بھائی آپ لڑکے کے متعلق چھان بین کریں۔ اگر سب ٹھیک ہے تو میں ریحانہ کی شادی کی بات پکی کرلوں۔''

''تم فکر مت کرو۔'' بھائی نے کہا۔ ''میں جلد معلومات حاصل کر کے تمہیں مطلع کروں گا۔''

ایک ہفتے کے بعد نسیم احمد صاحب آئے اور بہن سے کہا کہ انہوں نے سب پتہ لگالیا ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے لیکن سنا ہے کہ لڑکے کو اکثر مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ اگر سلسلہ برقرار رہا تو دماغ پر اثر پڑ سکتا ہے۔

''بھائی جان آپ کا شکریہ۔ بے باپ کی بیٹی ہے خدانخواستہ کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو کون سنبھالتا۔ اب اگر ان لوگوں کا ٹیلی فون آیا تو میں انکار کردوں گی۔''

دو ماہ بعد معلوم ہوا نسیم صاحب کی بیٹی کی منسوب پکی ہوگئی ہے اور ہفتہ عشرہ میں شادی ہونے والی ہے۔ چنانچہ دو دن بعد نسیم احمد آئے اور شادی کا کارڈ بہن کو دیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بھتیجی کی شادی ہے، دیکھو آنا نہ بھولنا۔''

بیگم صدیقی نے خوشی کا اظہار کیا۔ بھائی کو مبارکباد دی اور شادی میں شرکت کا وعدہ کیا۔

نسیم احمد کے جانے کے بعد بیگم صدیقی نے لفافہ کھول کر کارڈ دیکھا۔ دیکھتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ یہ تو وہی لڑکا تھا جس سے ریحانہ کی نسبت آئی تھی۔ بھائی نے تو اس لڑکے کے بارے میں بتایا تھا کہ اسے دورہ پڑتا ہے تو پھر بھائی نے اپنی لڑکی سے بات کیسے طے کرلی۔ بیگم صدیقی کے دماغ میں مختلف خیالات آتے رہے اور بھائی کی طرف سے بدگمانی جنم لینے لگی۔ بیگم صدیقی یہ سمجھنے پر مجبور تھیں کہ جس طرح لڑکے کے متعلق مجھے بتایا گیا ہوسکتا ہے میری لڑکی کے متعلق بھی ان لوگوں کو کچھ کہہ دیا گیا ہو، جبھی تو ان لوگوں کا پھر ٹیلی فون نہیں آیا۔

بہر حال بیگم صدیقی شادی میں بھرپور طریقے سے شریک ہوئیں۔ بارات میں آئی ہوئی سمدھن سے ملاقات ہوئی تو انہیں تعجب ہوا کہ بیگم صدیقی اور نسیم بھائی بہن ہیں۔ بیگم صدیقی

نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا مجھے فیصلہ کرنے میں تاخیر ہوگئی اور آپ لوگوں کو وقت پر جواب نہ دے سکی۔ لڑکے کی ماں نے کہا کہ نسیم صاحب نے تو آپ لوگوں کی طرف سے ناپسندیدگی کی اطلاع دے دی تھی اور متبادل کے طور پر اپنی لڑکی کی پیشکش کر دی تھی جسے ہم لوگوں نے کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لیا تھا۔

بیگم صدیقی کو بھائی کی منافقت پر بہت رنج ہوا لیکن ضبط سے کام لیتے ہوئے خاموش رہیں۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد جب بھائی بیگم صدیقی سے ملنے آئے تو بیگم صدیقی نے بھائی سے کہا۔

''بھائی آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ جو لڑکا میرے لئے نامناسب تھا وہ آپ کے لئے کیسے قابلِ قبول ہوا۔''

نسیم احمد نے مسکراتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''تمہیں معلوم نہیں! جوڑے آسمان پر بنتے ہیں!''

☆☆☆

عربی نسل کا گھوڑا

علی کبیر گاؤں کے چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔انہیں گھوڑے پالنے اور گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔اچھے سے اچھا گھوڑا رکھنا ان کے ذوقِ سلیم کا خاصہ تھا۔وہ ہر شام گھوڑے پر سوار ہو کر آٹھ دس میل کا چکر لگاتے۔اصطبل، سائیس اور سواری کے دیگر لوازمات کا وہ خاص خیال رکھتے تھے۔

ایک دن ان کے ہونے والے سمدھی منصور علی تشریف لائے۔دونوں میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتے ہوتے علی کبیر صاحب کے گھوڑے کی بات نکل آئی۔علی کبیر صاحب اپنے گھوڑے کی صفات میں رطب اللسان تھے۔منصور صاحب گھوڑے کی تعریف سنتے سنتے اکتا گئے تو گفتگو میں لقمہ دیتے ہوئے بولے۔

''بھائی آپ کا گھوڑا واقعی قابلِ تحسین ہے لیکن ہے تو دیسی۔گھوڑا دنیا میں عربی نسل کا مانا جاتا ہے۔ آپ عربی گھوڑا اپنی سواری میں استعمال کریں۔''

علی کبیر کو ان کی بات دل کو لگی اور اسی فکر میں رہے کہ عربی نسل کا گھوڑا حاصل کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد علی کبیر صاحب عمرہ کے لئے سعودی عرب گئے۔عمرہ کی سعادت سے فارغ ہونے کے بعد انہیں عربی گھوڑے کا خیال آیا۔مکہ اور مدینہ میں انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ عربی نسل کے گھوڑے کہاں دستیاب ہوں گے۔لوگ سن کر ہنستے اور کہتے جناب یہاں کی حکومت تو بیرونِ ملک سے گھوڑے درآمد کرتی ہے، آپ یہاں عربی گھوڑے کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔علی کبیر صاحب نے ہمت نہ ہاری اور تلاش کا سلسلہ جاری رہا۔آخر ایک بوڑھے بدّو نے بتایا کہ عربی نسل کا گھوڑا نجران میں ملے گا، وہاں کچھ تاجر گھوڑے کی افزائش کرتے ہیں۔علی

ہ کبیر کے لئے مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس نجران کا ویزا نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی مشکل بدو سے بیان کی تو اس نے وہاں کے حاکم سے ملنے کا مشورہ دیا۔ کوشش بسیار کے بعد علی کبیر کی رسائی حاکمِ مکہ تک ہوگئی۔ انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا اور بڑی عاجزی سے اجازت طلب کی جو مل گئی۔

علی کبیر اسی بدو کو لے کر نجران گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ وہاں سے بیس میل دور ایک قصبہ ہے جہاں گھوڑے کی افزائش کی جاتی ہے۔ دونوں وہاں پہنچے اور مول تول کے بعد ایک مشکی رنگ کا عربی نسل کا گھوڑا خرید لیا۔ گھوڑا فروخت کرنے والے نے بتایا کہ یہاں کے گھوڑے وفادار اور خوددار ہوتے ہیں۔

''گھوڑے کو احتیاط سے رکھنا ہوگا اور اس کے رہنے سہنے، کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔'' علی کبیر کو بتایا گیا۔

سودا طے ہونے کے بعد گھوڑے کو پانی کے جہاز کے ذریعہ روانہ کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ایک عربی سائیس کو بھی بھیج دیا گیا تا کہ راستے میں وہ اس کا خیال رکھے۔

گھوڑا گاؤں آ گیا۔ اس کے لئے خاص اصطبل بنوایا گیا اور اسی عربی کی ہدایت کے مطابق کھانے پینے کا اہتمام کرنے کے بعد اس عربی کو واپس کر دیا گیا۔ اپنے سائیس کو علی کبیر صاحب مسلسل ہدایات دیتے رہتے تا کہ گھوڑے کی رکھوالی میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ عربی گھوڑے کی آمد کی خبر سن کر دور دراز سے لوگ آتے اور اسے دیکھ کر واہ واہ کرتے۔

علی کبیر حسب معمول دس بارہ میل کا چکر روزانہ گھوڑے پر لگاتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جب وہ چکر لگا کر واپس آ رہے تھے تو گاؤں کی خشک برساتی ندی کے پاس گھوڑا رک گیا اور کوشش کے باوجود وہ اڑتا رہا۔ علی کبیر کو غصہ آیا۔ گھوڑے کو برا بھلا کہا اور دو چار چابک بھی رسید کر دی۔ گھوڑا یکبارگی زوردار قدم بڑھاتا ہوا چکر لگانے لگا اور علی کبیر کے قابو سے بالکل باہر ہوگیا۔ علی کبیر لگام چھوڑ کر زین پکڑ کر گھوڑے کی پشت سے چپک گئے۔ گھوڑا چکر لگاتا ہوا، جست لگاتا ندی کو پار کر گیا۔ ندی میں چھپے ہوئے علی کبیر کے گھات میں بیٹھے مسلح لوگوں نے شور مچایا ''میواں نکل گئے لو۔'' اس طرح علی کبیر بہت بڑے خطرے سے بچ گئے۔ گھوڑے نے علی کبیر کو گھر پہنچا کر دم

لیا۔علی کبیر کو اب احساس ہوا کہ گھوڑا کیوں آگے بڑھنے سے رک رہا تھا۔اسے خطرے کا احساس ہو گیا تھا، واقعی گھوڑا بہت وفادار اور حساس جانور ہے۔

حسب معمول سائیس نے گھوڑے کو زین سے آزاد کیا اور تھوڑی دیر ٹہلا کر اصطبل میں لے آیا۔لیکن اس نے دیکھا کہ گھوڑا بہت ہی ست اور رنجیدہ نظر آ رہا ہے۔کھانے کو دیا گیا تو اس نے کھانے سے منہ موڑ لیا۔صبح کو رمضان سائیس نے علی کبیر سے کہا کہ سرکار گھوڑا بیمار ہے، نہ کچھ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے۔علی کبیر فوراً اصطبل پہنچے تو دیکھا گھوڑے کی آنکھ سے آنسو رواں ہے اور اس کی حالت تشفی بخش نہیں ہے۔علی کبیر نے فوراً گاؤں کے قریب ایک قصبے میں ایک آدمی کو روانہ کیا اور جانوروں کے ڈاکٹر کو فوراً بلوایا۔ڈاکٹر کے آنے پر علاج شروع ہوا۔ڈاکٹر نے بتایا کہ بظاہر کوئی بیماری نہیں ہے، اس کو کوئی صدمہ پہنچا ہے، شاید کسی نے مارا پیٹا ہو۔

''یہ حماقت مجھ سے ہی ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب۔'' علی کبیر نے کہا۔''یہ گھوڑا میرا محسن ہے۔اس نے مجھے دشمنوں کے نرغے سے بچایا ہے۔''

علی کبیر نے پوری روداد ڈاکٹر کو سنادی اور کہا۔''ڈاکٹر صاحب اس گھوڑے کو بچالیں، میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''یہ گھوڑا عربی نسل کا معلوم ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' علی کبیر نے کہا۔

''یہ گھوڑا جانبر نہیں ہو سکے گا۔'' ڈاکٹر نے مایوسی سے کہا۔''میں نے عربی گھوڑے کے بارے میں پڑھا ہے کہ یہ بہت ہی حساس اور خوددار ہوتا ہے۔اگر اس کے مالک کو اس کی وفاداری پر ذرا بھی شک ہو جائے تو گھوڑا اسے برداشت نہیں کرتا اور اپنی جان دے دیتا ہے۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق چھ سات دن موت و حیات کی کشمکش میں رہ کر گھوڑے نے دم توڑ دیا۔علی کبیر کو بہت صدمہ ہوا۔وہ بار بار کہتے کہ وہ عربی گھوڑے کی صفات سے واقف نہیں تھے ورنہ یہ حادثہ پیش نہ آتا۔

''میں ہی اس کا قاتل ہوں۔اللہ مجھے معاف کرے۔''

☆☆☆

سانپ اور سپیرا

رستم سپیرا کچہری کے سامنے فٹ پاتھ پر روزانہ مجمع لگایا کرتا اور طرح طرح کی کہانیاں سنا کر لوگوں کو جمع کرتا۔ کبھی آوازیں لگاتا:

''سانپ کا کاٹا،
بچھو اور کتے کا کاٹا
منٹوں میں اچھا
بابو جی آزما کر دیکھیں
بابو جی تریاق لے جائیں
اور پریشانی سے بچیں
اگر نامردی ہے تو اصلی سلاجیت لے جائیں،
سانڈھے کا تیل لے جائیں اور جوان ہو جائیں''

وہ کبھی بین بجا کر سانپ کو پٹاری سے نکال کر اسے جھومنے کا موقع فراہم کرتا۔ کبھی مٹھی باندھ کر سانپ کو للکارتا اور ڈسنے کا موقع دیتا۔ اگر کبھی سانپ کے دانت اس کی مٹھی پر لگ جاتے تو وہ اپنا بنایا ہوا تریاق اس پر لگا لیتا اور پھر اپنی دھن میں لگ جاتا:

''بابو جی کچھ لیتے جاؤ
آپ کا بھی بھلا اور میرا اور
میرے بال بچوں کا بھی بھلا

بابو جی مدد سمجھ کر لیتے جاؤ۔"

رستم کو اسی طرح مجمع لگاتے ہوئے برسوں سے میں دیکھتا آرہا تھا۔ جاڑا ہو، برسات ہو یا جیٹھ اس کے معمولات میں فرق نہ آتا اور آتا بھی کیسے وہ تو اس کا ذریعہ معاش تھا۔ وہ لوگوں کو کہانیاں سناتا، دوائیں بیچتا اور اپنے بال بچوں کے ساتھ گزر بسر کرتا۔

ایک دن بڑی سخت گرمی تھی، رستم اسی طرح فٹ پاتھ پر درخت کے سائے میں حسب معمول اپنی دھن میں مگن تھا۔ طرح طرح کی آوازیں لگانے کے بعد ہر روز کی طرح اس نے مٹھی باندھی اور سانپ کو للکارا۔ سانپ پھن مارتا اور رستم اپنی مٹھی ہٹا لیتا۔ وہ یہ کرتب دکھا ہی رہا تھا کہ اچانک سانپ نے لپک کر اس کے ہاتھ پر زوردار طریقے سے ڈس لیا۔ رستم نے فوراً سانپ کو پٹاری میں بند کیا اور کہا:

"آج اس نے زوردار دانت مارا ہے۔"

پھر اس نے اپنی تریاق کی شیشی نکالی اور زخم پر لگا کر بدستور اپنے دھندے میں لگ گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کو اندازہ ہوا کہ رستم پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی ہے اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔ لوگ اندازہ ہی لگا رہے تھے کہ رستم زمین پر بیہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے کہا:

"سانپ کے زہر کا اثر ہے جو رستم کے جسم میں پھیل گیا ہے۔ فوراً اسے اسپتال لے جانا چاہئے۔"

لوگوں نے اس کے شاگرد سے کہا۔ "تو سارا سامان سمیٹ کر رستم کے گھر لے جا۔ ہم لوگ رستم کو ہسپتال لے جا رہے ہیں۔"

اسپتال کے ڈاکٹروں نے انجکشن لگایا اور مختلف ضروری اقدام کئے لیکن سب بیسود۔

رستم جانبر نہ ہو سکا اور اپنے پالے ہوئے سانپ کے ہاتھوں دائمی نیند سو گیا۔ رستم کو سانپ کی جبلت کا بخوبی اندازہ تھا لیکن اپنی غفلت سے وہ اس حادثے کا شکار ہو گیا۔

رستم کی موت کی خبر سن کر کئی سپیرے جمع ہو گئے اور جھاڑ پھونک کرنے لگے۔ لیکن ان

لوگوں کا کوئی منتر کارگر نہ ہوا۔ کوڑی بھی اڑائی گئی اور دوسرے اقدامات بھی کیے گئے لیکن رستم کی سانس واپس نہ آئی۔

انتقام انسانی جبلت میں شامل ہے۔ لوگوں نے کہا۔

''رستم کی موت سانپ کے ڈسنے سے ہوئی ہے اس لئے سانپ کو مار دینا چاہئے۔ جان کے بدلے جان۔''

کچھ لوگوں نے کہا۔ ''رستم کی موت دم گھٹ جانے سے ہوئی ہے۔ اس لئے سانپ کی موت بھی ویسی ہی ہونی چاہئے۔''

چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ رستم کے ساتھ سانپ کو بھی پٹاری میں بند رستم کی قبر میں دفن کر دیا جائے تاکہ اس کی موت بھی دم گھٹنے سے ہو جائے۔ ویسے بھی سانپ اور سپیرا لازم و ملزوم ہیں!

☆☆☆

ٹومی

سراج الدین ایک بڑے عمارت ساز میں شمار ہوتے ہیں۔ بڑے کاروبار کے مالک ہیں۔ شہر میں مختلف جگہ ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ سراج صاحب کو کتا رکھنے کا شوق ہے۔ ہمیشہ وہ ایک اچھی نسل کا کتا رکھتے ہیں۔ کتے کی دیکھ بھال کا بھی وہ پورا خیال رکھتے ہیں۔ کتے کو دن بھر زنجیر سے باندھ کر رکھتے اور رات کو سوتے وقت اسے کھول دیتے تاکہ رات بھر وہ چوکیداری کرتا رہے۔ کتے کو اگر ذرا بھی رات کو کوئی آہٹ محسوس ہوتی یا خطرہ محسوس کرتا تو وہ بھونک بھونک کر لوگوں کو بیدار کر دیتا۔

ایک دن تقریباً رات کے آٹھ بجے سراج محل کی گھنٹی بجی۔ ملازم نے پھاٹک کھولا تو دیکھا تین صاحبان کھڑے ہیں۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سراج صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنا کارڈ دیا۔ ملازم نے اندر جا کر سراج صاحب کو مطلع کیا اور کارڈ پیش کیا۔ سراج صاحب کارڈ کو الٹ پلٹ کر پڑھتے رہے لیکن اس شخص کو شناخت نہ کر سکے۔ بہرحال کارڈ کا کچھ ایسا اثر ہوتا ہے کہ آدمی ملنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سراج صاحب نے ملازم کو ہدایت کی کہ وہ ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔ چند لمحوں بعد سراج صاحب بھی ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ علیک سلیک کے بعد سراج صاحب نے ان لوگوں سے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

ان لوگوں نے بتایا کہ وہ ایک بڑا پلازہ تعمیر کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور سراج صاحب سے مشورے کی ضرورت ہے۔

''پلازہ کا نقشہ وغیرہ کہاں ہے؟'' سراج صاحب نے دریافت کیا۔

''وہ دفتر میں ہے۔آپ کو زحمت دینی ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہم لوگوں کے ساتھ چلیں، گاڑی موجود ہے، آپ کو ہم لوگ واپس گھر پہنچادیں گے۔''

''آپ لوگ ایسا کریں کل دس بجے صبح میرے دفتر میں کاغذات لے کر آجائیں۔'' سراج صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''جو مناسب مشورہ ہوگا دوں گا۔''

''دراصل پلازہ کے مالک کل امریکہ چلے جائیں گے۔ان کے پاس وقت نہیں ہے۔آپ تھوڑی دیر کے لئے چلے چلیں اور اپنے مفید مشورے سے نوازیں۔'' ان لوگوں نے اصرار کیا۔

''میں اس طرح کہیں نہیں جاتا، میں معذرت چاہتا ہوں۔'' سراج صاحب نے کہا۔

ان میں سے ایک کا رویہ تبدیل ہوگیا۔''تمہیں ابھی وقت چلنا ہوگا۔''

پھر تینوں نے اپنے اپنے پستول نکال لئے اور سراج صاحب کو کھینچ کر باہر لے جانے لگے۔سراج صاحب نے شور مچایا تو گھر کے سارے ملازمین اور ان کے دونوں بیٹے ڈرائنگ روم میں جمع ہوگئے۔ان کو دیکھتے ہی اغوا کرنے والوں نے کہا۔

''جو بھی نزدیک آئے گا اسے گولی کا نشانہ بنادیا جائے گا اور ایک گولی سراج صاحب کے سینے میں اتار دیا جائے گا۔''

یہ منظر دیکھ کر سراج صاحب نے اپنے بیٹوں اور ملازمیں کو کہا کہ تم لوگ خاموش رہو اور دعا کرو۔

وہ سب جیسے ہی سراج صاحب کو باہر لائے تو ٹومی نے سراج صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر بھونکنا شروع کردیا اور زنجیر سے آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے لگا۔سراج صاحب کے لڑکوں کا جب دھیان ٹومی کی طرف گیا تو ان لوگوں نے کتے کے اشارے کو سمجھ کر اسے آزاد کردیا۔ کتا کھلتے ہی بے تحاشہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔لوگ اس کے پیچھے بھاگے لیکن کتا پھاٹک بند دیکھ کر چہاردیواری پھلانگ کر باہر غائب ہوگیا۔

سراج صاحب کے بیٹوں نے اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دی۔ پولیس آئی اور مختلف سوالات کے بعد یہ کہتے ہوئے چلی گئی کہ ہر ممکن کوشش وہ لوگ سراج صاحب کی بازیابی کے لئے

کریں گے۔

تقریباً ڈھائی بجے رات ٹومی گھر لوٹا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔ گھر کے سارے افراد جاگ رہے تھے۔

''لگتا ہے ٹومی واپس آ گیا ہے۔'' سراج صاحب کے بڑے بیٹے نے کہا اور ملازم کو گیٹ کی طرف دوڑا دیا۔

ملازم کے گیٹ کھولتے ہی ٹومی دوڑتا ہوا اندر آیا اور بھونکنے لگا۔ سراج صاحب کے بیٹے بھی باہر آ گئے۔ ٹومی ان لوگوں کو دیکھتے ہی ان کے قریب آ کر سراج صاحب کے بڑے بیٹے کے کپڑے کو منہ میں لے کر کھینچنے لگا اور باہر چلنے کا اشارہ کرتا رہا۔ ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ ٹومی نے سراج صاحب کا سراغ لگا لیا ہے۔

''ہمیں اس کے ساتھ چلنا چاہیے۔'' بڑے بیٹے نے کہا۔

پھر انہیں خیال آیا کہ ان وگوں کے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ٹومی کو تھپکی دے کر خاموش کر دیا اور پولیس کو اطلاع دی کہ وہ لوگ جلدی پہنچیں سراج صاحب کا سراغ مل گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں پولیس آ گئی۔ سراج صاحب نے ٹومی کی بے قراری بتائی اور یہ قیاس کیا کہ ٹومی کو اس جگہ کا پتہ چل گیا ہے۔ پولیس نے بھی اتفاق کیا کہ کتا بڑا احساس ہوتا ہے، یقیناً اسے علم ہو گیا ہے۔

چنانچہ قافلہ ٹومی کی رہنمائی میں روانہ ہوا۔ آگے آگے ٹومی اور پیچھے پیچھے پولیس اور سراج صاحب کے بیٹے۔ تقریباً پانچ کلومیٹر چلنے کے بعد ٹومی ایک گاؤں میں داخل ہو گیا اور گلی در گلی جاتے ہوئے وہ ایک مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور بھونکنے لگا۔

اغوا کرنے والوں نے کتے کی آواز سن کر گھر کی بالکنی سے دیکھا تو وہ کتے کو پہچان گئے۔ انہیں خطرہ محسوس ہوا۔ ان لوگوں نے تڑاتڑ گولیاں چلا کر کتے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اسی اثنا میں پولیس نے گھر کو گھیر لیا اور معمولی مزاحمت کے بعد تینوں اغوا کرنے والوں کو حراست میں لے لیا اور سراج صاحب کو ایک بند کمرے سے بازیاب کر لیا۔

سب لوگ جب باہر آئے تو ٹومی کو خون میں لت پت مردہ پڑا پایا۔ سراج صاحب نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

’’وفا کا پیکر ٹومی اپنی جان کا نذرانہ دے کر امر ہو گیا۔‘‘

☆☆☆
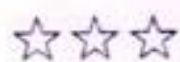
مٹھو

ناصرہ بیگم کو سارے گھر والے مغلانی بی کہتے تھے۔ وہ گھر میں سب سے بزرگ تھیں اس لئے پورے خاندان پر مغلانی بی کی حکومت تھی۔ بیٹا، بہو، پوتا، پوتی، نوکر چاکر سب کے سب مغلانی بی کے زیر اثر تھے۔ مغلانی بی کو طوطا پالنے کا بہت شوق تھا۔ وہ طوطے کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ اسے طرح طرح کے جملے سکھاتیں۔ مختلف قرآنی آیات رٹواتیں؛ سلام کرنا، اذان دینا بتاتیں۔ گویا ہر روز طوطے کو سبق دیا جاتا اور پھر اس کی مشق کروائی جاتی۔

طوطا صبح ہوتے ہی اذان دیتا، چیخ چیخ کر لوگوں کو نماز پڑھو، نماز پڑھو کہہ کر بیدار کرتا۔ جو بھی سامنے آتا اسے سلام کرتا۔ کوئی اس کی تعریف کرتا یا کھانے کو دیتا اسے شکریہ کہہ کر احسان کا اعتراف کرتا۔ گھر کے ہر فرد کا نام اسے یاد تھا۔ کبھی قرآنی آیت تلاوت کرتا۔ وہ طوطا کیا تھا ایک عجوبہ تھا۔ اس کی ساری خوبیاں مغلانی بی کی تعلیم کی وجہ سے تھیں جو روزانہ اسے نئی نئی باتیں بتاتی رہتیں۔ طوطا ان کی باتوں کو غور سے سنتا اور پھر اسے دہراتا۔ شاید یہ طوطے کی جبلت میں شامل ہے!

ایک دن تفریح کے لئے سارے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ گھر بند کر کے رکھوالی کے لئے صدر دروازے پر رفیق چوکیدار کو بٹھا دیا گیا تھا۔ رفیق دروازے پر تنہا بیٹھا تھا کہ اس گھر کا پرانا ملازم نادر آ گیا۔ نادر کئی سال تک اس گھر میں ملازم رہ چکا تھا۔ حال ہی میں یہاں کی ملازمت چھوڑ کر کسی کارخانے میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ رفیق اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر رفیق نے نادر سے کہا۔

''نادر بھائی، کچھ دیر آپ میری ڈیوٹی سنبھال دیں گے؟ میری بہن بہت بیمار ہے، اسے دیکھ کر میں

ایک گھنٹے میں آجاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ میں دیکھ لوں گا۔'' نادر نے جواب دیا۔

رفیق کے جانے کے بعد نادر نے مکان کا جائزہ لیا۔ ہر طرف اسے دروازہ بند ملا۔ جب وہ جائزہ لیتے ہوئے مکان کے عقب میں گیا تو اسے ایک باتھ روم کا دروازہ کھلا ملا۔ شاید صفائی کے لئے کھولا گیا ہو اور جاتے وقت اس کو بند کرنے کا خیال نہ آیا ہو۔ نادر اسی دروازے سے اندر داخل ہوا اور مختلف کمروں کا جائزہ لینے لگا۔ نادر جب تک اس گھر کا ملازم رہا، ایمانداری اور وفاداری سے کام کرتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں آج اس پر شیطان غالب آگیا تھا اور اس کی نیت خراب ہو رہی تھی۔ اس گھر میں موجود جو بھی نقدی، زیورات اور دیگر قیمتی اشیا ہاتھ لگیں، وہ سمیٹتا گیا اور ایک ٹیبل کلاتھ میں ساری چیزوں کو اکٹھا کر کے باندھ لیا اور اسی باتھ روم کے ذریعہ باہر آگیا۔ اور مسروقہ اشیا کی گٹھری کو ایک قریب کے جانے پہچانے دکاندار کے پاس امانتاً رکھ کر واپس آگیا۔ اور رفیق کے آنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔

گھر کے لوگ جب واپس آئے تو گھر کا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ بہت ساری چیزیں غائب تھیں۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کہ چوری ہوگئی۔ گھر والے سخت حیران تھے کہ گھر بند تھا، چوکیدار موجود تھا، پھر چیزیں کیسے غائب ہوگئیں۔ ہنگامہ سن کر طوطا بول پڑا 'نادر چور، نادر چور'۔ مغلانی بی نے کہا۔ ''نادر کہاں سے آگیا۔ وہ تو کب کا چلا گیا ہے، طوطا بکواس کر رہا ہے۔''
رفیق کو بلا کر پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے کہا۔ ''اندر کون اور کیسے آتا، سارے دروازے تو بند تھے۔''

گھر والوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو ان لوگوں نے پولیس کو رپورٹ کردی۔ پولیس آئی اور حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد رفیق چوکیدار کو حراست میں لے لیا۔ وہ رو رو کر کہتا رہا کہ وہ بے قصور ہے، اس نے چوری نہیں کی۔

''یہ تو تفتیش سے پتہ چلے گا کہ چوری کس نے کی۔ فی الحال تمہیں حراست میں رہنا پڑے گا۔'' پولیس نے اس سے کہا۔ گھر والوں کو بھی رفیق پر رحم آرہا تھا۔ وہ کافی طویل عرصے سے ملازم تھا اور اس سے کبھی کوئی ہیر پھیر نہیں ہوئی۔ گھر والے آپس میں مختلف انداز سے واقعے پر روشنی ڈالتے

لیکن گاہے گاہے طوطا ہی رٹ لگائے ہوئے تھا 'نادر چور، نادر چور۔'

گھر والوں کو آخر طوطے کی اس رٹ کا نوٹس لینا ہی پڑا۔ ممکن ہے گھر والوں کی عدم موجودگی میں نادر آیا ہو اور رفیق کو جُل دے کر گھر کے اندر کسی طرح داخل ہو کر چوری کر لی ہو۔ مٹھو نے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھا ہو جب ہی بار بار رٹ لگا رہا ہو۔ فیصلہ ہوا کہ پولیس سے کہا جائے کہ نادر کو بھی شامل تفتیش کر لیا جائے۔ جب رفیق سے پوچھا گیا کہ اس روز نادر وہاں پہنچا تھا تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس نے کچھ دیر گھر کی رکھوالی بھی کی تھی۔ پولیس نے شک کی بنا پر نادر کو بھی حراست میں لے لیا۔ چوری کے الزام میں رفیق اور نادر کا چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

مجسٹریٹ کی عدالت میں دونوں نے جرم سے انکار کر دیا۔ عدالت نے پولیس سے کہا کہ الزام کے ساتھ ثبوت اور گواہان پیش کرے اور مسروقہ مال کی برآمدگی بھی بتائے۔ پولیس بالکل لاچار تھی۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ صرف شک کی بنیاد پر ان لوگوں کو عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔

''گھر کے تمام افراد پکنک پر گئے ہوئے تھے اور وہاں صرف ایک طوطا رہ گیا تھا جو چشم دید گواہ ہو سکتا ہے۔'' پولیس نے عدالت کو بتایا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔'' مجسٹریٹ نے ڈانٹ دیا۔ ''گواہی انسان کی ہوتی ہے جانور کی نہیں۔''

سرکاری وکیل نے سرگوشی میں مجسٹریٹ سے کچھ کہا جس پر مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ اگلے روز دس بجے دونوں ملزمان اور طوطے کو عدالت میں پیش کیا جائے۔

چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ طوطے سے پوچھا گیا۔

''مٹھو، چور کون ہے، رفیق یا نادر۔''

طوطا فوراً بولا تھا۔ ''نادر چور، نادر چور۔''

طوطے نے اتنی بار یہ رٹ لگائی کہ عدالت میں سماں بندھ گیا۔ مجسٹریٹ نے نادر سے پوچھا۔

''طوطا کیا کہہ رہا ہے؟''

نادر نے کہا۔ ''حضور طوطا سچ کہہ رہا ہے۔ چوری میں نے ہی کی ہے اور مال میں نے محفوظ کر رکھا ہے۔ میں سب کچھ آپ کے حوالے کر دوں گا، میں نے اس میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کیا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ میں نے جس گھر کا برسوں نمک کھایا ہے وہیں میں نے ڈاکہ ڈالا۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے سخت سے سخت سزا دی جائے تا کہ میرا کچھ کفارہ ادا ہو جائے۔''

عدالت نے رفیق کو رہا کر دیا۔ مال مسروقہ ان کے مالک کے حوالے کر دیا اور نادر کو چھ ماہ قید سخت کی سزا سنا دی۔ عدالت نے فیصلے میں مزید لکھا کہ عدالت میں گواہی ہمیشہ انسان کی ہوتی ہے لیکن شاید یہ پہلا اتفاق ہے کہ ایک چھوٹا سا پرندہ پولیس سے بڑھ کر سراغ رساں نکلا جس نے عدالت کی مشکل کو آسان کر دیا۔

☆☆☆

نام: محمد جمیل احسن

قلمی نام: جمیل عظیم آبادی

والد کا نام: مولوی محمد یوسف مرحوم

تاریخ پیدائش: ۷ جنوری ۱۹۲۴ء

(سرٹیفکیٹ میں ۷ جنوری ۱۹۲۸ء درج ہے)

جائے پیدائش: عظیم آباد (پٹنہ)، بہار، بھارت

آبائی وطن: موضع خیر پور کبیر (کھٹا) ضلع نالندہ (بہار)

تعلیم: بی۔کام، ایچ۔ایم۔بی

ملازمت: (ر) اکاؤنٹس آفیسر، محکمۂ تار و ٹیلی فون پاکستان

موجودہ پیشہ: ہومیو پیتھی ڈاکٹر

جمیل عظیم آبادی کی مطبوعات:

۱۔ دل کی کتاب — غزلیں — ۱۹۸۴ء

۲۔ گیان درپن — دوہے، گیت — ۱۹۸۵ء

۳۔ وحدت و مدحت — حمد و نعت — ۱۹۸۷ء

۴۔ آب و سراب — نظمیں — ۱۹۹۳ء

۵۔ گلہائے صد نگار — غزلیں — ۱۹۹۷ء

۶۔ گلِ سہ برگ — ثلاثی، ماہیے، ہائیکو — ۱۹۹۷ء

۷۔ الرحمٰن — حمد — ۲۰۰۰ء

۸۔ المدثر — نعت — ۲۰۰۰ء

۹۔ روایت کے قیدی — کہانیاں — ۲۰۰۳ء

زیر ترتیب:

۱۔ قطعات و رباعیات

۲۔ نعت و حمد

۳۔ دوہے

۴۔ مضامین و تبصرے

۵۔ ہومیو پیتھی طریقۂ علاج پر کتابیں